اسلامی روایات کا تحفظ

www.KitaboSunnat.com

پروفیسر جمیل واسطی

مجلس فلاح و تعلیم

A. Halim

بسم اللہ الرحمن الرحیم
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ
مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام
محدث لائبریری
کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

اسلامی روایات کا تحفظ

سیّد محمد جمیل واسطی ایم، اے (کینٹب)

مجلسِ فلاح و تعلیم

۱۷۔ ایڈورڈ روڈ۔ لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ ہیں

یکے از مطبوعات سلسلۂ فلاح و تعلیم (ویلفیئر اینڈ ایجوکیشن پبلیکیشنز سیریز)

جنرل ایڈیٹر

ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ کے واسطی

ناشر ——— مجلس فلاح و تعلیم لاہور

طابع ——— ایور گرین پریس۔ لاہور

کتابت ——— عبدالکریم سندھو

تعداد ——— دو ہزار

طبع دوم ——— مارچ سنہ ۱۹۷۱ء

قیمت ——— روپے

ملنے کے پتے :

مجلس فلاح و تعلیم ۱۔ ایڈورڈ روڈ۔ لاہور

مکتبہ کارواں، کچہری روڈ۔ لاہور

فہرست مقالات

نمبر مقالات	نام مضمون	صفحہ
مقالہ اوّل	علم و عمل	۱۱
مقالہ دوم	مسلمانوں پر مغربی تہذیب کا اثر	۲۷
مقالہ سوم	پردہ	۳۹
مقالہ چہارم	تعدّد ازدواج	۶۳
مقالہ پنجم	خنزیر خوری	۷۷
مقالہ ششم	صنم پرستی	۸۷
مقالہ ہفتم	نسلی تعصّب	۱۰۵
مقالہ ہشتم	تہذیبِ اسلامیہ کے کچھ اور پہلو	۱۲۱

ضمیمے

ضمیمہ نمبر ۱	مغرب میں عورت	۱۴۳
ضمیمہ نمبر ۲	ادب و فن کا ایک پہلو	۱۷۷
ضمیمہ نمبر ۳	عربی سائنس اور یورپ	۱۸۵

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقدمہ طباعت ثانی
سنہ ۱۹۷۱ء

"اسلامی روایات کا تحفظ" کی طباعتِ ثانی کے لیے اصل متن میں کہیں کہیں طباعت کی تصحیح کی گئی ہے اور کئی جگہ ضمنی اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ کئی صفحوں کے زیرین حاشیوں میں اُن امور کے حوالے دیئے گئے ہیں جو اس کتاب کی پہلی طباعت کے بعد رو پذیر ہوئے۔

اس کتاب کے پہلے دو مقالے سنہ ۱۹۳۴ء میں پڑھے گئے۔ سنہ ۱۹۳۹ء تک یہ سب مقالے اُردو یا انگریزی میں غیر منقسم ہندوستان اور انگلستان میں منتخب حاضرین کی مجالس میں پیش کئے جا چکے تھے۔ بعد میں گاہے گاہے ان مقالوں میں اضافے ہوتے رہے۔ آخری تین ضمیمے وہ مقالے ہیں جو میں نے حیدرآباد کی مجلسِ احباب میں پڑھے۔ ویسے اس کتاب میں کوئی بنیادی تغیر نہیں کیا گیا۔

قیامِ پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک کی آزادی کے بعد اسلامی روایات کی اقدار مسلمانانِ عالم کی زندگی میں ایک نیا مقام رکھتی ہیں۔ مغربی معاشرت کی نقل اب پچھلی تاریخ کی پیدا کردہ ذہنی پریشانی کے تسلسل کی صورت ہے اور اگرچہ مفاد پرستی اور استحصال نے وقت گذرنے سے نقل کی ہوئی مغربی روایات کو بھی ہمارے ذہنوں اور ہماری معاشرت میں کافی مضبوط بنا دیا ہے پھر بھی حقائق کی روشنی میں قومی ضمیر اور خود شناسی موجودہ زمانے میں وہ راستہ زیادہ آسانی سے پہچان سکتے ہیں، جسے تاریخی

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بدقسمتیوں کی دُھند نے نظر سے اوجھل کر دیا تھا۔ خداوندِ کریم ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم درست راستے پر خدمتِ انسانی کے پاکیزہ جذبے کے ساتھ گامزن ہو سکیں۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں اراکینِ انجمن فلاح و تعلیم لاہور کا اور خاص طور پر صدرِ انجمن پیرزادہ عبدالمجید صاحب ایڈووکیٹ کا تہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی طباعتِ ثانی کا کام اپنے ذِمّے لے لیا اور لطیف فاروقی صاحب کی امداد سے بطرزِ احسن سرانجام دیا۔

۲ر فروری ۱۹۷۱ء

۱۵۵۔ کے۔ بلاک نمبر ۲

پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی

خوشحال روڈ۔ کراچی ۲۹

جمیل واسطی

مقدمہ (طباعتِ اوّل)

ریوان وِنکل کا قصہ ہر امریکن کو یاد ہے۔ جب ریوان وِنکل پریوں کی شراب کے نشے سے بیس سال کی بے ہوشی کے بعد جاگا تو اس نے دیکھا کہ دنیا کا رنگ بدل چکا ہے۔ امریکہ شاہِ انگلستان کی غلام نوآبادی ہونے کی بجائے ایک آزاد ریاست کا وقار حاصل کر چکا ہے اور لوگوں کے دل و دماغ میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا ہے اور یہ انقلاب بچارے ریوان وِنکل کی قدیمی ذہنیت کے لیے سخت تحیّر کا باعث تھا۔

اسی قسم کا انقلاب دنیائے اسلام میں بھی واقع ہو رہا ہے۔ اگر کوئی مسلمان ریوان وِنکل کی طرح ۱۹۱۴ء میں سو کر آج جاگ اُٹھے تو وہ موجودہ اسلامی معاشرت، ادب، ذہنیت اور مقاصد میں ایسے تغیّرات محسوس کرے گا کہ وہ ہماری زندگی کو اپنے نقطۂ نظر سے بمشکل اسلامی زندگی کہہ سکے گا۔

ذیل کے مقالات میں اس تغیّرِ عظیم کی تشریح کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم چونکہ اس انقلاب میں رہ رہے ہیں۔ شب و روز کے تسلسل کی وجہ سے اس کی پوری شدت سے واقف نہیں ہیں۔ کیا یہ انقلاب یورپ کی برتری کے اصلی اسباب کے حصول کی شعوری کوشش ہے یا محض ہزیمت و غلامی کی بدحواسی کا نتیجہ؟ کیا یورپ کی موجودہ نقل ایک بلند تمدّنی مقصد کا لازمی ذریعہ ہے یا محض احساسِ کمتری کا کرشمہ؟ میں نے ان مسائل کی تشریح اور ان کے حل اور جواب کی کوشش کی ہے۔ جو حضرات بھی تعلیمی، سماجی، منصبی، ذاتی و دیگر اسباب کی بناء پر مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں، میرے دل میں ان کی رائے کا پورا احترام ہے اور ان سے پوری ہمدردی ہے۔ میں اپنے حل و تشریح کے حق میں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ میں نے علمی بے غرضی سے حالات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور مجھے اپنی بحث کے ہر پہلو کی درستی پر مکمل اعتماد ہے۔ جس تہذیب کو ہم تہذیبِ جدید کہہ کر اپنا رہے ہیں اس کی بنیادیں یورپ کی قدیمی روایات ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی کوتہ نظری اور غلط فہمی سے یورپ کی بڑھیا کو اپنے یہاں معشوقۂ نوعمر کا درجہ دے دیں۔ مجھے ہر حالت میں یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ میرے اور بھائی بھی انہی مسائل میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں جو میرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالات کا مضمون ہیں۔ بقولِ غالبؔ ؎

سب رقیبوں سے ہے ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

نیز ممکن ہے کہ چند احباب کو پہلے دو ابواب میں خیالی و بیانی الجھن کا احساس ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو تہذیبی و تمدنی مسائل زیرِ بحث ہیں وہ خود اتنے پیچیدہ ہیں کہ بیان میں بلا تاریخی، تمدنی، مذہبی، منطقی و فکری عناصر کے امتزاج کے سمجھ میں نہیں آسکتے۔ ان کے حل و علاج پر غور کرنا ایک پیچیدہ فکری عمل ہے۔ اس لیے میری یہی درخواست ہے کہ احباب پہلے دو ابواب کو ضرور کوشش اور توجہ سے مطالعہ فرمائیں۔

آخر میں مجھے اپنے مہربان دوستوں کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ مولانا عبداللہ قریشی کا اولین حوصلہ افزائی کے لیے۔ جب میں نے پہلا مقالہ پڑھا تو انہوں نے حاضرین کے اصرار پر فوراً مجھ سے لے کر طبع کرایا اور انجمن معین الاسلام لاہور کے ممبروں میں مفت تقسیم کیا۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کا اس اشتیاق کے لیے جس سے انہوں نے چند مقالات کو مجھ سے حاصل کر کے اپنے رسالہ "برہان" میں طبع فرمایا اور پھر حضرت احسان دانش کا ان تمام مقالات کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے۔ احسان صاحب نے یہ کام محض خدمتِ ملت کی غرض سے اپنے سر لے لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو کامیابی بخشے اور اجر دے۔ آمین۔

جمیل واسطی

عرضِ ناشر

(از پیرزادہ عبدالمجید بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ ایڈووکیٹ۔ صدر انجمن فلاح و تعلیم۔ لاہور)

"انجمن فلاح و تعلیم" جو ایک غیر سیاسی اور غیر فرقہ دارانہ جماعت ہے، عرصہ دس سال سے ایسے کاموں میں دلچسپی لیتی رہی ہے، جن کا مقصد خلقت کی فلاح و بہبود اور سوسائٹی میں ثقافتی علم کی اشاعت ہے۔ اس کے اراکین ایسی مساعی میں مصروف ہیں جو عقل و منطق کی بنیاد پر مجلسی اور ثقافتی استقلال کے حصول میں ممد و معاون ہو سکیں۔ اسی مقصد کے لئے ہمیں اُن خیالات پر ناقدانہ غور کرنے کی ضرورت ہے جو بیرونی اثرات کے ماتحت ہماری سوسائٹی میں داخل ہو رہے ہیں تاکہ محض بے توجہی میں خاموشی سے یہ خیالات ہماری مسلّمہ مجلسی اقدار کو کمزور نہ کر سکیں۔ وہ ثقافت جس کی پاکیزگی اور عظمت ہزار سال تک تاریخِ عالم میں ضیا بکھیرتی رہی، اس مسلّمہ اور آزمودہ ثقافت کو مغربی اور مشرقی جدید اور قدیم کے ارزاں تعصبات کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے علم اور عقل، تشریح و تنقید کو بروئے کار لانا ہماری "ویلفیئر اینڈ ایجوکیشن پبلیکیشنز سیریز" کی اشاعت کا بنیادی مقصد ہے اور یہی مقصد ہمارے لئے پروفیسر جمیل واسطی کی کتاب "اسلامی روایات کا تحفظ" کی طباعت کا محرک ہوا ہے۔

ہم اس انجمن کے بانی ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ کے واسطی کے بصد دل و جان ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے علاوہ صحتِ طفلاں کے مختلف پروگراموں کی نگرانی کرتے ہوئے بھی کبھی ہمیں فراموش نہ کیا اور انجمن کو ہمیشہ اپنے قیمتی اور مخلصانہ مشوروں اور مساعی سے نوازتے رہے۔ ان کی نگرانی میں یہ انجمن قریباً دس سال سے لاہور میں مذہبی اور ثقافتی موضوعات پر تقاریر، مباحثے، سٹڈی گروپ، سیمینار اور درس و تدریس کے کام بڑی تندہی سے سرانجام دیتی رہی ہے۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ کے واسطی ان کاموں کو اپنی طبّی مصروفیات کی جائز توسیع خیال کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اپنے طبّی کاموں میں بھی وہ خلقت کی فلاح و تعلیم میں ہی مصروف رہتے ہیں اور اُنہیں اس خدمت میں ہی خوشی ہے۔ اللہ اجر دے۔

کتاب زیرِ طباعت "اسلامی روایات کا تحفظ" میں فاضل مصنّف نے اسلامی روایات کی موجودہ صورتِ حال پر خنک منطق کی روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے روایات کے متعلق مدافعت یا عذر خواہی کا رویّہ اختیار نہیں کیا بلکہ علم الاخلاق کے فلسفیوں اور ماہرینِ عمرانیات کی طرح نئے پیدا شدہ مسائل کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقائق کو واضح کرنے کے عمل میں ہی پچھلے ہزار سال کے تجربہ کی روشنی میں اُن مسائل کے تجزیہ اور تحلیل کی جانب رہنمائی کی ہے۔ انہوں نے نقلی دلائل کو نظر انداز کر کے علم و دانش اور عقلی استدلال کی سطح پر چیلنج کو قبول کیا ہے۔ ان کے نزدیک صداقت کا علم ہی کذب کے خلاف اعلیٰ ترین دلیل بن جاتی ہے اور خود حقیقت ہی علمِ کلام کی معقول ترین بنیاد ہے۔

اس کتاب میں ضروریاتِ مضمون نے اُردو زبان کے بیانی امکانات کو بھی واضح کیا ہے۔ جو علمی مواد اس کتاب میں موجود ہے وہ مشرق کی لائبریریوں میں کمیاب ہے۔ قارئینِ کرام اس کتاب کے مطالعہ میں دانش و حکمت کے ذہنی تجربوں سے محظوظ ہوں گے اور ختم کرتے ہوئے عروجِ ملّت کی درست راہ کی سمت دیکھ رہے ہوں گے۔

میں پروفیسر جمیل واسطی کے ہی ایک شعر (از فکرِ جمیل) پر اس نوٹ کو ختم کرتا ہوں ؎

دامِ دل۔ جلوۂ صد رنگِ تمنّا ہر سُو
سامنے جادۂ یک رنگِ یقیں دیکھتے ہیں

عبدالمجید

(ویلفیئر اینڈ ایجوکیشن پبلیکیشنز سیریز میں مقاصدِ انجمن کے مطابق معیاری کتب و مضامین طباعت کے لیے قبول کیے جاتے ہیں)

سیکرٹری انجمن فلاح و تعلیم۔ لاہور

مقالہ اوّل

علم و عمل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی روایات کا تحفّظ انسانی بہبود کی اعلےٰ ترین کوشش کا تحفّظ ہے۔ تمام مذاہب سچائی کے متلاشی ہیں۔ لیکن ہر طرف منہ اٹھا کر چلتے رہنے سے ہم سچائی تک نہیں پہنچ سکتے۔ کسی منزل تک پہنچنے کے لیے درست اور سیدھی راہ صرف ایک ہوا کرتی ہے اور مسلمانوں کے نزدیک وہ شاہراہ اسلام ہے۔ اسلام کے اصولوں پر عمل کرنا باطنی سچائی کو ظہور کا لباس پہنانا ہے۔ روایت عمل کا تواتر ہے۔ اس لیے اسلامی روایات کا تحفظ انسانی زندگی میں دائمی صداقتوں کے اعلےٰ ترین اظہار کا تحفّظ ہے۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں خود مسلمانوں نے اسلامی روایات کے متعلق شرمساری اور معذرت خواہی کا رویّہ اختیار کر لیا ہے اور عام مسلمانوں کے غیر اسلامی روایات کو کم و بیش قبول کر لینے سے یہ صاف عیاں ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں قبول کردہ غیر اسلامی روایات کو ردّ کردہ اسلامی روایات پر فوقیت حاصل ہے مسلمانوں کے دل و دماغ میں ایک انقلاب رونپذیر ہو رہا ہے جس سے اسلامی روایات کی وقعت روز بروز کم ہو رہی ہے اور اسلام کی صدا پر دل کی گونج میں ایک ماندگی پائی جاتی ہے جو مستقبل کے لیے نیک شگون نہیں۔

ان حالات کے احساس کے ساتھ ان حالات کی تشریح کی جستجو لازمی ہے۔

حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال مبارک سے ایک سو سال کے اندر مسلمان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے مالک ہو چکے تھے۔ تمام شمالی افریقہ زیرِ نگیں تھا۔ طارق کی پہاڑی کو ایک ہزار میل جنوب کی جانب چھوڑ کر ہسپانیہ اور جنوبی فرانس کے مسلمان حکمران پیرس سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر طوخ کے تاریخی شہر پر قابض ہو چکے تھے۔ مشرق میں ایران مفتوح ہو چکا تھا اور اسلامی عساکر محمد بن قاسم کی سرکردگی میں شمالی ہندوستان کو دنیائے اسلام کا دائمی حصّہ بنا چکے تھے۔ یہ کارنامے اسلامی فتوحات کی صرف تمہید تھے۔

۸۲۷ء میں زیادہ اللہ امیر قیروان (شمالی افریقہ) نے صقلیہ کی باقاعدہ تسخیر شروع کی۔ پلرمو ۸۳۱ء میں مفتوح ہو گیا اور اس فتح سے اطالوی جزیرہ نما پر حملوں کا راستہ کھل گیا۔ "۸۴۶ء میں ہلال کی فتوحات شہر روما تک پہنچ گئیں اور اسلامی عساکر نے پطرس و پولوس کے مندروں کو تاخت و تاراج کیا۔"[1] ادھر ہسپانیہ کے اسلامی مجاہدین جنوبی فرانس سے آگے بڑھ کر سوئٹزرلینڈ اور شمالی اطالیہ پر حملہ آور ہوئے۔

مشرقی یورپ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ دیر میں شروع ہوا۔ ۱۳۹۲ء میں سلطان ترکی نے نکوپولس (بلغاریہ) کے میدان میں جرمنی، ہنگری، فرانس اور دوسرے عیسائی ممالک کی متحدہ افواج کو شکست دی۔ ۱۵۲۱ء میں سلطان سلیمان عظیم الشان نے بلغراد (دار الخلافہ یوگوسلاویہ) پر قبضہ کیا۔ ۱۵۲۶ء میں ہنگری کی افواج کو زبردست ہزیمت ہوئی اور ہنگری اسلامی سلطنت کا حصّہ بن گیا۔ ۱۵۲۹ء میں وائنا کو ایک دراز محاصرہ سے کمزور کر کے سلطان سلیمان ایک زبردست فوج لے کر جرمنی پر حملہ آور ہوا۔

منگول حملہ آوروں نے ۱۲۲۴ء میں روس کے تمام عیسائی حکمرانوں کی متحدہ افواج کو عظیم الشان شکست دی۔ ۱۲۳۸ء میں تمام روس منگولوں کے قبضہ میں آ چکا تھا۔ شمال ماسکو پر ان کی حکومت تھی۔ جنوب میں ان کی افواج بلقان پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ ان کی حکومت چین سے بحیرہ بالٹک تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے اعلیٰ ترین حکمران "طلائی عساکر

[1] لفظی ترجمہ عیسائی مؤرخ سنگر

کے بادشاہ" کہلاتے تھے اور جب "طلائی عساکر کے بادشاہ" حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو تمام روس ایک زبردست اسلامی سلطنت بن گیا۔ ایک عیسائی مورخ بیان کرتا ہے کہ "ان بادشاہوں نے مذہب کے معاملہ میں آزادی اور رواداری کے اصولوں کو قائم رکھا۔"

ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا ذکر غیر ضروری ہے۔ محمود غزنوی۔ علاء الدین خلجی اور اورنگ زیب عالمگیر کی کامیاب لڑائیوں نے ایک ہزار سال تک جنوبی ایشیا کو اسلامی صوبہ بنائے رکھا۔

آخری دو سو برس میں یہ اسلامی سلطنت جو چین سے بحر ظلمات تک پھیلی ہوئی تھی، تباہ ہو گئی۔ سولہویں صدی کے آخر میں عیسائیوں نے غرناطہ کی آخری مسلمان ہسپانوی سلطنت پر اپنا قبضہ جما لیا اور ان مسلمانوں کے قتال کا سلسلہ شروع ہوا جنھوں نے اسلام ترک کرنے سے انکار کیا۔ یہی حال مسلمانوں کا جنوبی اطالیہ صقلیہ اور مالٹا میں ہوا اور مفتوح ہونے پر روس اور وسطی اور مشرقی یورپ میں آخری دو سو سال کی تاریخ اسلامی ہزیمت کی تاریخ ہے۔ اگر بنظر غائر اسلامی زوال کے سانحہ عظیم کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زوال لابدی تھا۔

مسلمان نہ صرف تمام دنیا میں توحید الٰہی اور انسانی مساوات کا پیغام لے کر پھیل گئے بلکہ انہوں نے اپنی فتوحات سے دنیا کی عظیم ترین حکومت کی بنیاد رکھنے کے علاوہ کبھی اطلب العلم ولو کان بالصّین کے سبق کو فراموش نہ کیا۔ اسلامی فتوحات کی پہلی ڈیڑھ صدی کے اندر یونانی علوم فطرت کا ادب عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ جالینوس کا ترجمہ خاص بغداد میں عباسی خلفا کے اہتمام سے ہوا۔ خلیفہ مامون رشید نے بغداد میں ایک کتب خانہ اور ایک ادارہ تراجم قائم کیا[1]۔ اور اسی طرح قاہرہ میں علمی ادارے قائم ہوئے۔ قرطبہ ہسپانیہ میں ستّر کتب خانے قائم تھے۔ خلفا و امرا کو کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ یونانی کتب کوشش سے تلاش کی جاتی تھیں اور بغداد میں منگوا کر ترجمہ کی جاتی تھیں۔ علاوہ جالینوس کے

[1] "بیت الحکمت"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افلاطون، ارسطو، اقلیدس، طولمی اور ارشمیدس کی کتب آٹھویں صدی عیسوی تک یونانی سے عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔ حساب، جغرافیہ، علمِ نجوم، علومِ فطرت، سیاست، فلسفہ غرض کوئی شعبہ نہ تھا جس میں مسلمانوں نے ترجموں سے اپنی تشنگی کو سیراب نہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ کئی یونانی تصانیف آج کل صرف عربی ترجمہ میں باقی ہیں۔ ان کے اصلی یونانی نسخے تلف ہو چکے ہیں[1]۔ علاوہ یونانی کے لاطینی، فارسی، چینی، سنسکرت اور دوسری زبانوں کے تراجم بھی کیے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مختلف ممالک میں مختلف زمانوں میں مختلف تہذیبیں اپنی اپنی زبانوں میں علوم جمع کرتی رہیں اور یہ علوم اسلام کا انتظار کرتے رہے تاکہ عربی کے ذریعہ دنیا کی اعلیٰ ترین اخلاقی تہذیب کا ورثہ بن جائیں۔

مسلمانوں نے نہ صرف گذشتہ تہذیبوں کو تاریخ عالم میں پہلی دفعہ ایک زبان میں اکٹھا کیا جو ان کے قرآن حکیم کی اور تمام دنیائے اسلام کی تہذیبی زبان تھی بلکہ وہ اپنی علمی کوششوں سے گذشتہ تہذیبوں کے علوم و فنون سے کہیں آگے ترقی کر گئے۔ حساب میں ابوالوفا، طبیعات میں الکندی، علم نجوم میں الفرغانی اور البتانی تاریخی نام ہیں۔ خط استوا[2]، زمین کا گول ہونا اور اپنے محور کے گرد اور سورج کے گرد زمین کا گھومنا، یورپ سے پہلے مسلمان معلوم اور قبول کر چکے تھے۔ بعد کی علمی ترقی نے صرف ان کے قیاسیات کو ثبوت بہم پہنچائے۔ جابر نے علم کیمیا میں تجربہ کی ضرورت پر توجہ مبذول کی۔ ابوعلی حسن نے یہ دریافت کیا کہ ہوا زمین سے جس قدر اونچی ہوتی ہے اسی قدر ہلکی ہوتی جاتی ہے۔ اسلامی تہذیب نے رازی اور ابن سینا جیسے حکیم و طبیب پیدا کیے۔ مفردات و مرکبات کی خصوصیات میں تفتیش کی اور ضخیم مواد جمع کیا۔ الجبرا کی سب سے اوّلین مستند کتاب ایک مسلمان خوارزمی کی تصنیف ہے۔ علومِ فطرت کے علاوہ تاریخ، فلسفہ، تفسیر، مصوّری اور تعمیر کے فنون میں مسلمان دنیا کے اُستاد تھے۔ اسلامی

[1] شارٹ ہسٹری آف سائنس مصنفہ شرڈ ٹیلر۔

[2] دی ایریبیز مصنفہ برٹرام ٹامس۔

تمدن کا یہ پہلو ایک مفصّل کتاب بلکہ کئی جلدوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ایک انگریز مؤرخ تسلیم کرتا ہے کہ "یورپ کے قرونِ وسطیٰ عربی سائنس کی شہرت سے گونج رہے تھے"۔ یہ ناممکن تھا کہ سائنس کی اتنی ترقی ہر شعبۂ حیات پر اپنا اثر نہ رکھتی۔ تہذیب انسانی زندگی کی ایک مرکب حالت ہے جس میں مختلف اجزا اتفاقی لیکن منطقی امتزاج میں پائے جاتے ہیں جس زمانے میں مسلمان تہذیبی ذخائر کی فراہمی میں مصروف تھے، یہ زمانہ اسلامی فتوحات اور اسلامی سلطنت کی مسلسل ترقی کا زمانہ تھا۔ غیر اسلامی حکومتیں یکے بعد دیگرے اسلامی دنیا کی حلقہ بگوش ہو رہی تھیں اور خلفائے اسلام تاریخ کی عظیم ترین سلطنت کے سیاسی و مذہبی فرمانروا تھے۔ سلطنت کی یہ ترقی قدرتی اور لابدی تھی۔ اسلام کے روشن اصولوں نے مسلمانوں کے دلوں سے توہم پرستی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے سامنے دنیا حیوانی یا انسانی دیوتاؤں کی بے اصول طاقتوں کا مظہر نہ تھی بلکہ ایک مسبب الاسباب خدا کی قدرت کا کرشمہ تھی۔ خداؤں کی پیدائش کے معجزے، ان کی خوارق العادت زندگی کے افسانے اور خداؤں کی فرضی کہانیوں سے فطرت کی جھوٹی تشریحیں علومِ فطرت کی ترقی کے لیے بہترین ماحول نہیں ہوتیں۔ اسلام کی روح توہمات کی قاطع تھی۔ مسلمان کے لیے فطرت خوفناک خداؤں کی بستی نہ تھی۔ خدائے واحد کی مخلوق کی حیثیت رکھتی تھی اور انسان اشرف المخلوقات تھا۔ فطرت کا مطالعہ خدا کی نعمتوں کا جائز تصرف تھا۔ علومِ فطرت جب ضروریاتِ حیات سے متعلق ہوتے ہیں تو اس کا نتیجہ صنعت ہوتا ہے۔ قصر الحمراء قرطبہ کی عظیم الشان مسجد جو آج کل بطور کلیسا استعمال ہو رہی ہے، مراکش، قیروان، دمشق اور دہلی کی مساجد، قاہرہ کے خلفاء کے مقابر، کشمیر اور لاہور کے شالامار باغ، تاج محل اور لال قلعہ ایک عظیم الشان تہذیب کی خوبصورت یادگاریں ہونے کے علاوہ اسلامی صنعت کی سربلندی کی بھی شاہد ہیں۔ اسلامی ممالک کے کپڑے۔ ریشم۔ قالین۔ مینا کاری کے کام اور دیگر تجارتی فنون تمام دنیا میں معیاری حیثیت رکھتے تھے اور اسلامی دنیا سے باہر دور دور تک فروخت ہوتے تھے۔ یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے ادب میں مسلمانوں کی امارت و تمول کے بے شمار حوالے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملتے ہیں۔ یہ دولت اسلامی دنیا کی صنعت کا خراج تھی۔

علومِ فطرت کے حصول سے انسان سرمایۂ فطرت پر قابو پالیتا ہے۔ سرمایۂ فطرت کو اسرارِ فطرت کے علم کے ذریعہ انسانی بہبود کے لیے استعمال میں لانے کا نام صنعت ہے۔ اس قوت سے حالت امن میں ایک قوم کی زندگی آسان و دلکش بن جاتی ہے اور جنگ و مقابلہ کی صورت میں صنعت میں ترقی یافتہ قوم کو فطرت کی مسخر کردہ طاقتوں کی کمک حاصل ہوتی ہے۔ علوم کی ترقی کے باعث مسلمانوں کو اپنی ہمسایہ اقوام پر فوقیت حاصل تھی قلعہ سازی اور اسلحہ سازی میں برتری اسلامی افواج کی فتوحات کے بواعث میں تھی۔ اپنے وقت میں مسلمان دنیا کے اعلیٰ ترین جہاز ران تھے۔ ادریسی کے نقشہ[1] سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دنیا کو تمام دنیا کے ساحلوں کا علم تھا۔ منجنیق، قطب نما، اصطرلاب، بارود، توپ اور اسلامی صنعت کی دیگر تمام کوششیں اسلامی افواج کی امداد میں مہیّا تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مشرق و مغرب میں فتح و نصرت اسلامی لشکر کی رکاب چومتی تھی۔ نصف یورپ، نصف افریقہ اور تقریباً تمام ایشیا زیرِ نگیں تھے۔ روجر بیکن (۱۲۱۴-۱۲۹۴) ایک لاطینی خط میں پاپائے روم کو لکھتا ہے کہ "مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگیں کامیاب نہ ہوں گی۔ اگر آپ مسلمانوں کو یورپ سے نکالنا چاہتے ہیں تو عربی کے مطالعہ کے ذریعہ ان کے علوم فطرت کو حاصل کرنا ضروری ہے اور اس طاقت سے جو علوم فطرت سے ہمارے ہاتھ آئے گی، عیسائی دنیا مسلمانوں پر فتح حاصل کرے گی"۔ روجر بیکن عربی کا فاضل تھا اور اسے اس تحریک کا نمائندہ سمجھنا چاہیے جس کا مقصد اسلامی علوم و صنعت کو حاصل کرکے مسلمانوں کے ہتھیاروں سے اسلام کو شکست دینا تھا۔ اس نے خود بھی روشنی اور بصارت کے علم پر کچھ کتابیں لکھی ہیں جو عربی کتب سے ماخوذ ہیں۔ بارود کا نسخہ روجر بیکن نے ہی عربی سے حاصل کرکے یورپ کے سپرد کیا۔

[1] عجائب خانہ برلن۔ اس نقشہ میں شمالی بحر الکاہل کے مشرق کی طرف جو برِ اعظم دکھایا ہوا ہے، وہ ظاہر ہے کہ امریکہ ہے۔

غیر مسلموں کے لیے اسلامی علوم کا حصول چنداں دشوار نہ تھا۔ جہاں جہاں بھی مسلمان گئے انھوں نے علوم کی حفاظت کا خیال رکھا اور اسی ارادے سے یونیورسٹیاں قائم کیں یورپ کی سب سے پہلی یونیورسٹی جنوبی اطالیہ کے شہر سلرنو میں نویں صدی کے شروع میں قائم کی گئی۔ جب کہ یورپ کا یہ حصّہ اسلامی سلطنت کا حصّہ تھا۔ اسلامی دُنیا کی حدود ایک بین الاقوامی تہذیب کا گہوارہ تھیں۔ ان کی مذہبی رواداری کے باعث ان کے علوم کے دروازے سب کے لیے کھُلے تھے اور سلرنو کی یونیورسٹی میں یہودی اور عیسائی نہایت اطمینان سے مسلمان طلباء کے ساتھ تعلیم پاتے تھے۔ یہی حال ہسپانیہ کی قرطبہ، سیول اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں کا تھا جہاں یہودی اور عیسائی یورپ کی تاریکی سے اسلامی علوم کی روشنی حاصل کرنے آتے تھے اور جہاں وہ رواداری عملاً نظر آتی تھی جو اسلامی دُنیا سے باہر کسی مذہبی تمدن نے تمام انسانی تاریخ میں پیش نہیں کی۔

شروڈ ٹیلر اپنی کتاب "سائنس کی مختصر تاریخ" میں علوم کے متعلق یورپ کے رویّہ کی بابت تحریر فرماتے ہیں کہ عیسائیت تمام غیر عیسائی تاریخ و فلسفہ کو بے سود علم خیال کرتی تھی۔ عیسائی عقاید اور توہمات اور پرانے فسانوں کے چند حصّوں کی بلا تنقید قبولیت نو سو سنہ عیسوی تک یورپ کا اعلیٰ ترین علمی کارنامہ تھی۔ جس زمانے میں عرب اعلیٰ ترین طبّی علوم کے مالک تھے عیسائی ممالک جادو، منتر اور ٹوٹے ٹوٹکوں پر اعتبار رکھتے تھے اور انہیں علم الاجسام و ابدان سے کوئی واقفیت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سائنس کے لیے شک اور تجربہ ضروری ہے تاکہ یقین تک پہنچ سکیں اور شک کی عادت مذہب میں بدعتوں کی بنیاد بنتی ہے۔ بقول شروڈ ٹیلر صاحب اس زمانہ میں یورپ والے بہت سے بھوتوں کی ہستی کو مانتے تھے اور جادو منتر کے ذریعہ ان بھوتوں سے حاجت روائی کرانے کو درست مگر گنہ گاری خیال کرتے تھے۔ ان حالات میں سائنس کی ترقی غیر اسلامی یورپ میں ناممکن تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آخر اسلامی علوم کے حصول کے لیے یورپ والوں نے عربی علمی کتب کے تراجم لاطینی میں شروع کیے۔ جیرارد، کریمونوی، مائیکل سکاٹ اور رمین لل کے تراجم سے اسلامی علوم یورپ کا حصّہ بن گئے۔ لیکن مذہبی تعصّب کی وجہ سے یورپ کا علمی احیاء ایک سست عمل تھا۔ ۱۲۱۵ء میں یورپ نے ارسطو کے مطالعہ کو گناہ بنا دیا اور اس کے پڑھنے والوں کو سزاوار جہنم قرار دیا۔ اس وقت اسلامی دنیا علوم کی ترقی میں ارسطو کو کہیں پیچھے چھوڑ چکی تھی۔ ان کی یونیورسٹیاں مشاہدہ گاہوں، تجربہ گاہوں اور کتب خانوں سے مالا مال تھیں۔ علم کے متعلق یورپی اور اسلامی تہذیبوں کا رویّہ اس امر سے ظاہر ہو جائے گا کہ بقول شرڈ ٹیلر خلیفہ حاکم ثانی (۹۶۱ - ۹۷۶ء) کے قرطبہ کے کتب خانے میں چھ لاکھ کتابیں موجود تھیں اور ان کی فہرست چوالیس جلدوں میں تھی۔ لیکن اس وقت سے چار صدی بعد بھی فرانس کے شاہی کتب خانہ میں ایک ہزار سے بھی کم کتابیں تھیں۔

اس وقت جب کہ اسلامی دُنیا سات سو سال کی بلا رقیب سیادت کی وجہ سے اپنی دائمی نصرت اور حکومت کے اعتبار میں مطمئن بیٹھی ہوئی تھی۔ عیسائی دُنیا مسلمانوں سے حاصل کردہ سائنس کی ترقی اور[1] اپنی صنعت اور تجارت کی نشو و نما میں مشغول تھی۔ یہ کوشش مشینی صنعت اور یورپ کے موجودہ اقتصادی نظام اور یورپ کی عالمگیر تجارت میں منتج ہوئی۔

مشینی صنعت سے اشیاء بہت ارزاں، جلد اور زیادہ تعداد میں تیار ہو سکتی ہیں۔ اس سے نہ صرف سرمایہ اور دولت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ زندگی کی ضروریات بافراط میسّر آنے کی وجہ سے آبادی بھی بڑھتی ہے۔ آخری تین صدیوں میں یورپی آبادی اپنی پہلی آبادی سے کئی گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ ان حالات میں یورپ کو زائد تجارتی مال کے لیے منڈیوں کی اور بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے نو آبادیات کی ضرورت ہوئی۔ وہ ممالک جو تمدنی طور پر زراعتی حالت میں تھے اور جن میں صنعتی ترقی ابھی ابتدائی مدارج میں تھی، یورپ کی بہترین منڈیاں

[1] ضمیمہ نمبر ۳ عربی سائنس اور یورپ۔

بن گئے اور انہی ممالک کی تجارت سے حاصل کردہ سرمایہ کی امداد سے انہی ممالک کو فتح کر کے یورپ نے انھیں اپنی نو آبادیات بنا لیا۔

مراکش سے لے کر جاوا تک کے مسلمان اسی اصول کے ماتحت یورپ کی صنعتی ترقی اور اپنی اقتصادی بے حسی اور صنعتی غفلت کی وجہ سے محکوم و مغلوب ہو چکے ہیں۔ دُنیا کی قسمت زیادہ تر اقتصادی اور صنعتی قوتوں کے ہاتھ میں ہے۔ آسٹریلیا اور امریکہ کے اصلی باشندوں کی محکومی اور پھر ان کا نیست و نابود کر دیا جانا ترکی کی یورپ میں ہزیمت۔ شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی شکست اور غلامی۔ یورپ کی سیادت۔ جاپان کی ترقی۔ سب مشینی صنعت اور اس کے نتائج کے مختلف پہلو ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان اصولوں کے ماتحت یورپ اور یورپ سے باہر کی یورپی اقوام کی بڑھتی ہوئی آبادی اسلامی اقوام کو بھی محکوم کر کے آہستہ آہستہ امریکہ اور آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کی طرح فنا کر دے گی؟ درست پیشگوئی ناممکن ہونے کے باوجود یہ امکان قابل غور ضرور ہے کیونکہ جنوبی افریقہ اور مغربی[1] ایشیا میں یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قانون کے عمل سے مسلمانوں کی محکومی اور ان کی آئندہ نسلوں کی بتدریج ممکن معدومی کے ساتھ اسلام بھی فنا ہو جائے گا؟ اور یہ کہ اسلامی، مذہبی اور معاشرتی روایات کو زندہ اور قائم رکھ سکنے کی کیا تدابیر ممکن ہیں؟

جواب مشکل ہے۔ تاریخ کے مدّ و جزر حیران کن ہوتے ہیں لیکن اسلامی روایات کے تسلسل کے لیے فی الحال صرف تین ممکنات نظر آتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ہم اپنی خواہشات کو حاصل نہ کر سکیں اور یہ ممکنات محض خواہش کے دُھندلے خواب ہوں، مگر لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۵ مستقبل میں نسل انسانی کے لیے بے اسلام تاریخ کی ممکن بدقسمتی انتہائی غور و فکر کی مقتضی ضرور ہے۔

(۱) سب سے پہلی تدبیر جو اسلامی مذہب اور روایات کی حفاظت کے لئے لازمی

[1] فلسطین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمان جلد از جلد تجارتی مقاصد کے لیے مشینی صنعت کی طرف متوجہ ہوں اس کے لیے اقتصادی تنظیم اور عملی سائنس کا اکتساب بہت ضروری ہے۔ ایسی اسلامی یونیورسٹیوں کی ضرورت ہے جو علاوہ اسلامی مذہب و تمدّن کے ان مضامین پر خاص توجہ مبذول کریں۔ مشینی صنعت کے حصول سے ہم ان طاقتوں کو اپنی حفاظت کے لیے استعمال کر سکیں گے جو موجودہ حالت میں ہمیں آہستہ آہستہ مٹا رہی ہیں۔

اس ضمن میں یہ چند امور بھی فکر طلب ہیں۔ صنعتی اور تجارتی کاروبار، زراعتی کاروبار سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہوتا ہے۔ زراعت میں قدرت پیدائش کی ذمہ دار ہے لیکن صنعت میں خود انسان۔ اس لیے صنعت میں زراعت سے کہیں زیادہ دماغ و عقل و تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تجارتی آبادی زراعتی آبادی سے سیاسی طور پر زیادہ سمجھدار اور طاقتور ہوتی ہے۔

دوسرے جس طرح صنعتی ممالک زراعتی ممالک کو محکوم بنا لیتے ہیں، اسی طرح ایک ملک کے اندر بھی زراعتی آبادی، تجارتی اور صنعتی آبادی کی محکوم ہوتی ہے اور زراعتی آبادی اندرونی منڈی اور محکوم نوآبادی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور اس طرح ملک کی سیاسی اور تہذیبی طاقت ملک کے تجارتی اور صنعتی طبقوں میں مرکوز ہو جاتی ہے۔[1]

---

[1] یورپ کو یہ حالات بالکل واضح ہیں۔ مثلاً روس نے وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے متعلق جو اقتصادی پالیسی اختیار کی ہوئی ہے اس کا علم چین کے ثقہ ترین جریدے "پیکنگ ریویو" کے ان اقتباسات سے ہو سکتا ہے، جو ہفت روزہ "زندگی" لاہور کی ۲۳ فروری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں چھپے ہیں۔ اشتراکی روس کی پالیسی یہ ہے کہ خام پیداوار جس میں کپاس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وسط ایشیا کے مسلمان علاقے پیدا کریں لیکن اسی خام پیداوار سے متعلق فیکٹریاں ہزاروں میل دور خالص روسی علاقوں میں قائم ہوں۔

"سرکاری طور پر شائع ہونے والی کتاب 'اعداد و شمار' کے مطابق ان ریاستوں (ازبکستان، ترکمانیہ، تاجکستان اور کرغزیہ) میں کپاس کی کل پیداوار کا ۹۳ فیصد حصہ پیدا ہوا۔ یہ علاقے غلّے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تیسرے جس طرح صنعتی ترقی کی وجہ سے جاپان، اٹلی، جرمنی، برطانیہ، امریکہ اور دیگر ممالک کی آبادیوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے، اسی طرح اگر کسی ملک میں مسلمان محض زراعت میں مشغول ہیں اور تجارت اور صنعت غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے تو غیر مسلم آبادی میں اتنی ترقی ہوتی جائے گی کہ مسلمان آبادی کا تناسب قائم نہ رکھ سکیں گے۔ ان

---

۴۴ اور اون کی پیداوار کے بھی مرکز ہیں لیکن مذکورہ پیداوار سے متعلق ان علاقوں میں کوئی صنعت نہیں۔ مثال کے طور پر ازبکستان ملک بھر میں ۶۸ فیصد کپاس پیدا کرتا ہے لیکن یہاں کپڑے کی صنعت کل ملکی پیداوار کے ۳ فیصد کے برابر ہے۔"

ان علاقوں میں کیمیائی فرٹیلائزر کا کوئی کارخانہ نہیں بنایا گیا۔ خود روسی سرکار ان علاقوں سے خام اجناس پیداواری لاگت سے کم قیمت پر خریدتی ہے اور پھر بیج کے طور پر قیمت خرید سے پانچ گنا زیادہ قیمت پر مہیا کرتی ہے۔

"اس کے مقابلے میں گھٹیا قسم کی صنعتی اشیاء وسط ایشیا اور قازقستان میں نہایت اونچی قیمت پر بکتی ہیں..... وسط ایشیا کے فارموں کو جو ٹریکٹر اور مشینیں مہیا کی جاتی ہیں، وہ کوالٹی کے اعتبار سے نہایت ہی ناقص اور پست درجے کی ہوتی ہیں۔"

حیواناتی پیداوار بھی کم ہو رہی ہے۔ ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علاقے مرکزی حکومت کی بیگاری نوآبادیات ہیں۔ جنھیں اپنی پیداوار کا تعین کرنے کی آزادی نہیں اور جو بھی ان علاقوں کی پیداوار ہو وہ مرکزی حکومت اپنی مقرر کردہ کم قیمت پر چھین لیتی ہے۔ نہ وہ رکھ سکتے ہیں اور نہ قیمت زیادہ مانگ سکتے ہیں۔ اس سوشلزم کے فردوس میں وسط ایشیا کے فارم فرضدار ہوتے جا رہے ہیں اور کسانوں کی حالت ہندوستانی بنئے کے مظلوموں سے بھی بدتر ہے۔ یہاں کے لوگوں کی قوت خرید روسی ریاستوں کے مقابلے میں چالیس فیصد کم ہے اور اگر عوام ان حالات کے خلاف آواز بلند کریں تو اشتراکیت سے غداری اور حفاظت امن عامہ کی پیچیدگیاں خون کا خراج وصول کرتی ہیں۔

(سنہ ۱۹۷۰ء)

www.KitaboSunnat.com

حالات کی روک تھام کے لیے سب سے پہلی تجویز مسلمانوں کا مشینی صنعت کی طرف توجہ کرنا ہے اور اسلامی بقا کی دوسری تجاویز کے مقابلہ میں یہ تجویز زیادہ ممکن العمل اور نتیجہ خیز ہے۔

کیا مشینی صنعت کے قیام کے لیے مسلمان اقوام کو لاطینی رسم الخط اختیار کر لینا چاہیئے؟ کیا بے پردگی اور اس کے لازمی نتائج کو قبول کر لینا چاہیئے؟ کیا اس کے لیے شراب پینی چاہیئے یا ہیٹ کا استعمال کرنا چاہیئے؟ یہ سب غیر متعلق اور بے معنی سوال ہیں۔ جن سے غلامانہ ذہنیت اور خود غرضانہ ہوس پرستی ٹپکتی ہے۔ مشینی صنعت کا قیام مشینی صنعت کی طرف ہی علمی اور عملی توجہ کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے اقتصادی طاقتوں کی تنظیم پہلا قدم ہے۔ اسلامی ممالک کے حدود پر صنعتی پیداوار کی درآمد پر محافظتی محصول اور ملک کے سرمایہ فطرت کی صنعت کے ذریعہ ترقی مقصد کے حصول کے لازمی زینے ہیں۔ اس عمل کا ٹائی یا لپ سٹک سے چنداں تعلق نہیں۔

(۲) دوسری تجویز یہ ہے کہ مسلمان جہاں تک ہو سکے صنعتی ممالک میں ہجرت کر جائیں اور وہاں آباد ہو جائیں تاکہ تہذیبی مراکز سے متعلق ہو کر اسلام دنیا کے کلچر میں خاطر خواہ حصہ لے سکے اور یہ مسلمان یورپی شہریت کے حصول کے ذریعے باقی مسلمانوں کی سیاسی بدقسمتیوں سے محفوظ رہ سکیں اور شاید انہیں امداد بھی دے سکیں۔ جو اصحاب یورپ اور دیگر ممالک میں آباد ہونے کی غرض سے جائیں۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام اور اسلامی روایات و اخلاق کو اپنی معاشرت اور عمل میں ہمراہ لے جائیں اور اس احساس سے جائیں کہ وہ اسلام کی صداقت اور روایات کے امین ہیں، جن کی ہر تہذیب اور ہر زمانہ کے لوگوں کو ضرورت ہے۔

(۳) تیسری تدبیر صنعتی ممالک میں تبلیغ اسلام کی کوشش ہے۔ غیر مسلم اقوام کا مسلمانوں پر حق ہے کہ مسلمان انہیں پیغام حق سے محروم نہ رکھیں۔ یہ بات بھی نظر انداز

نہیں کرنی چاہیئے کہ اگر انسانی ارتقا یورپ کی ترقی یافتہ اقوام کو آئندہ دنیا کی قائم رہنے والی اور بڑھنے والی نسلیں منتخب کر چکا ہے تو بہتر ہے کہ ہم صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ تبلیغ و ہجرت کے ذریعے اسلام کو مغربی دنیا کا مذہبی اور تمدنی حصہ بنانے کی کوشش کریں تاکہ ہمارے مٹ جانے کے بعد آئندہ دنیا ان اسلامی روایات سے محروم نہ رہ جائے۔ جن کا تسلسل ہمیں اپنی اور اپنی نسلوں کی بقا سے زیادہ عزیز ہے۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ دوم

مسلمانوں پر مغربی تہذیب کا اثر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس باب میں میرا مقصد اُن اثرات کی تشریح ہے جو یورپ کے سیاسی غلبہ کی وجہ سے اسلامی دنیا میں رونما پذیر ہوئے۔ اگر ہم اسلامی تاریخ کو نقشہ کے ذریعہ ظاہر کریں تو اس کی صورت کچھ اس طرح ہوگی :-

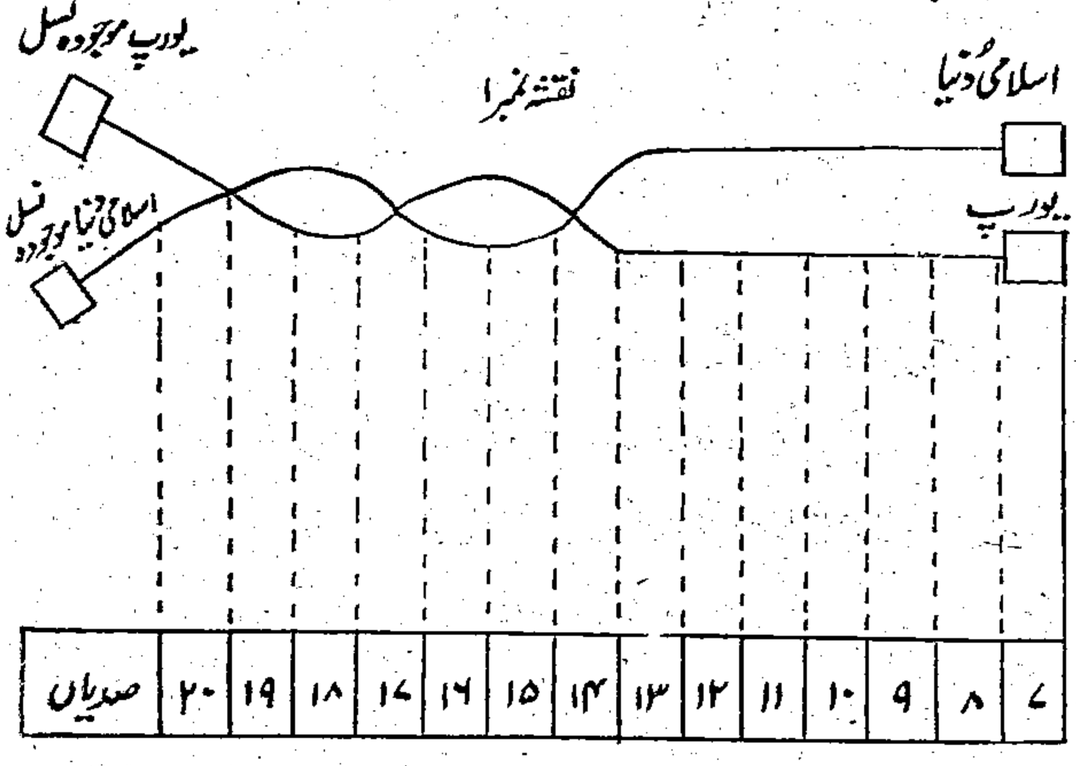

اسلامی دُنیا ساتویں صدی سے پندرھویں صدی تک یورپ کے خلاف کامیاب اور فتحمند رہی لیکن اس کے بعد یورپ میں اسلامی سائنس، تجارت اور صنعت کی نشوونما سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ طاقتیں پیدا ہوگئی تھیں جنھوں نے یورپ کو پہلے تو کامیاب مقابلہ کے لیے تیار کیا اور پھر اس کو تمام اسلامی دنیا پر غالب کر دیا۔

نقشہ نمبر ۱ میں یورپ اور اسلام کی موجودہ نسلوں کی کیفیت دکھائی گئی ہے۔ اسلام کی موجودہ نسل یورپ سے سیاسی طور پر مغلوب ہو چکی ہے اور اپنی تاریخ کو جانتے ہوئے دنیا میں یورپ کی برابری کی خواہشمند ہے۔

اس خیال سے کہ اگر یورپ اور اسلام کے تمام فرق دُور ہو جائیں تو یورپ اور اسلام برابر ہو جائیں گے مسلمانوں کی موجودہ نسل اپنی عقل کے مطابق یورپ کی مکمل نقل میں فلاح و نجات ڈھونڈھتی ہے اور یورپ کی طرزِ حیات سے ہر قسم کے اختلاف کو گھبراہٹ سے دیکھتی ہے۔ یہ طرزِ خیال مسلمانوں کی تاریخی سیاسی ہزیمتوں کا نتیجہ ہے اور اسلامی روایات پر سب سے بڑے صدمے اسی طرزِ خیال کا کرشمہ ہیں۔

دنیائے اسلام کی شکست اور یورپ کی فتح کی اصل وجہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یہ تھی کہ یورپ نے اسلامی دنیا سے سائنس کے حصول کے بعد سائنس اور مشینی صنعت کی ترقی اور اقتصادی تنظیم میں (جنھیں صلح و جنگ میں قوموں اور ملکوں کے "عناصرِ قوت" خیال کرنا چاہیئے) اسلامی دنیا کے مقابلہ میں زبردست برتری اور فوقیت حاصل کر لی اور جب یورپ کی اقوام نے ان طاقتوں کو صلح و جنگ کے مقاصد کے لیے مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا تو یورپ کی فتح اور اسلامی دنیا کی شکست اس کا لازمی نتیجہ تھی۔

انسانی تاریخ و سیاست قوتوں کا مقابلہ ہے۔ قوت کو قائم رکھنا جہد البقاء کی شرطِ اوّلین ہے۔ جب ایک قوم دوسری کے مقابلہ میں زیادہ قوت حاصل کر لیتی ہے، وہ دوسری قوم پر غالب آجاتی ہے۔ اس موقع پر اسلامی فلسفیوں کا یہ فرض تھا کہ وہ دنیائے اسلام کو ان "عناصرِ قوت" سے آگاہ کرتے رہتے جن کا یورپ میں ارتقا اسلام کی سیاسی ہزیمت کا باعث تھا اور دُنیائے اسلام کو علومِ فطرت اور صنعت کی ترقی اور اقتصادیات کی تنظیم کی

ضرورت کی طرف توجہ دلاتے رہتے۔ ان کا یہ فرض تھا کہ ان شعبوں میں غیر اسلامی دُنیا کی مقابلتہً ترقی کے مستقبل و سیاسی نتائج کا خوف دلا کر اسلامی دُنیا کو غیر اسلامی دُنیا کے برابر قوی اور مضبوط رکھتے لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

موجودہ نسل میں اسلامی طرزِ خیال کی تشریح نقشہ نمبر ۲ سے واضح ہو سکے گی:-

نقشہ نمبر ۲

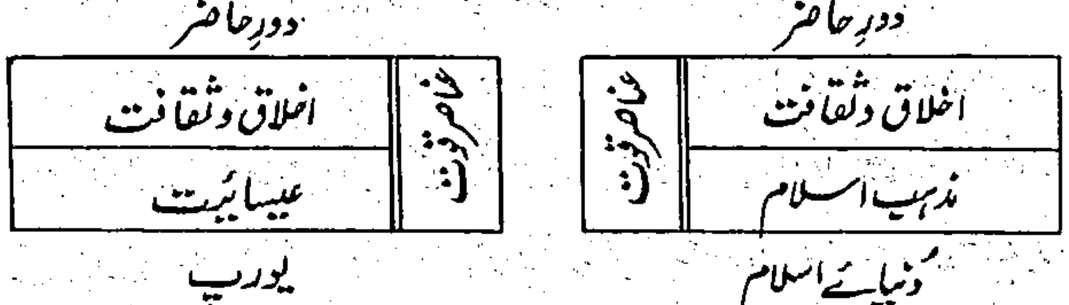

موجودہ تنزّل کے زمانے میں اسلامی خیالات میں ایک پریشانی پائی جاتی ہے، جس کی وجہ تہذیب و سلطنت کی ایک عظیم الشان روایت کی شکست اور ان کروڑوں انسانوں کی تلخ کش مکش اور بتدریج غلامی ہے جو ہزار سال سے آزاد اور دُنیا کے حاکم چلے آئے تھے۔[1]

یورپ کے مقابلہ میں دُنیائے اسلام کی عناصرِ قوت میں کمزوری اسلامی ہزیمت کی وجہ تھی اور یورپ کے مقابلہ میں عناصرِ قوت کو مضبوط و قوی تر کرنے سے اسلامی دُنیا اس ہزیمت کے سیلاب کو روک سکتی تھی اور اپنے عہدِ زرّیں کی یاد تازہ رکھ سکتی تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس تنزّل کے زمانے میں ایسے فلسفی پیدا نہ ہوئے جو تہذیب کی درست تشریح پیش کر سکتے۔ بجائے اس کے کہ وہ نقشہ نمبر ۱ کے مطابق پندرھویں سے سترھویں صدی تک

---

[1] دوسری عالمی جنگ کے بعد اسلامی دنیا کا ایک حصّہ سیاسی طور پر آزاد ہو چکا ہے لیکن عناصرِ قوت کی کمزوری، اقتصادی پسماندگی، غیر مرکزیت، ذہنی انتشار اور زبردست اقوام کے خوف یا اُن پر انحصار کی وجہ سے اکثر مسلمانوں میں وہ احساسِ کمتری موجود ہے جو یورپی ثقافت کی نقل میں مجلسی وقار کا متلاشی ہے اور اسلامی روایات کے کئی پہلوؤں کو پریشان کُن سمجھتا ہے۔ (۱۹۷۰ء)

محکم دلائل سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تاریخ میں ان نئی پیدا شدہ طاقتوں کی تلاش کرتے، جو ہماری ہزیمتوں کے دَور کو شروع کرنے میں کامیاب ہو رہی تھیں۔ اسلامی فلسفی اصلی عناصرِ قوت پر اُنگلی نہ رکھ سکے اور انہوں نے تمدن کے دوسرے عناصر کو عناصرِ قوت سمجھا اور ظاہر کیا اور تاریخ کو نظر انداز کر کے صرف موجودہ نسلوں کے سطحی مقابلہ سے قومی اصلاح کے اصول اخذ کیے۔ اس طرح انہوں نے اس پریشانی اور روایات کی شکست کے دَور کا آغاز کیا جو ابھی ختم نہیں ہوا۔

وہ فلسفی جو مذہب کو ہی عناصرِ قوت خیال کرتے تھے، دُنیا کی اقوام کی بلندی اور پستی کو ان کے مذہب کی بلندی اور پستی کے سوا کسی اور چیز سے متعلق نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے دُنیائے اسلام کی شکست کو اسلام ہی کی کمزوریوں پر محمول کیا اور تہذیب کی تشریح میں غلطی کر کے دنیوی قوت کے درست عناصر کو بالکل نظر انداز کر کے صرف مذہب ہی کو اسلامی دنیا کی شکست کا مجرم قرار دیا۔ ہم ان فلسفیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:-

اوّل وہ جنھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اسلام کی ہزیمت کا باعث یہ ہے کہ اسلامی الہام پُرانا ہو چکا ہے اور اسلام مذہبی ارتقاء کی پچھلی کڑی ہے اور جس طرح اسلام نے، پہلے الہامات کو منسوخ کر دیا اسی طرح اصولِ ارتقاء کا یہ تقاضا ہے کہ نئے الہام جو بدلتے ہوئے زمانے کے زیادہ مطابق ہوں مذہب انسانی کو اسلام سے ایک دو قدم اور آگے لے جائیں۔ ان فلسفیوں کے نزدیک آنحضرتؐ کا آخری نبی ہونا اور اسلام کا آخری مذہب ہونے کا دعوے کرنا فطرت کے دائمی اصولِ ارتقاء کے خلاف ہے، جس کا لازمی نتیجہ مسلمانوں کے جمود اور دُنیائے اسلام کی سیاسی شکست میں ظاہر ہوا۔ اس نئے الہام کی ضرورت کو ایران میں باب اور بہاء اللہ نے ظاہر اور پورا کیا۔ دونوں فلسفیوں نے اسی فلسفۂ ارتقاء کے ماتحت اپنے آپ کو نئے ملہموں کی صورت میں پیش کیا اور اپنی گفتار اور اپنے عقائد کو خدا کے تازہ ترین الہامات ظاہر کیا۔

ان فلسفیوں نے تہذیب کی غلط تشریح کی اور دنیائے اسلام کی دنیوی شکست کو

دنیوی قوت کے عناصر کی کمزوری پر محمول کرنے کی بجائے مذہب اسلام کو اسلامی دُنیا کی شکست کا ملزم ٹھہرایا۔ ان فلسفیوں کی قوت تشریح کی کمزوری اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اُنھوں نے اصولِ ارتقاء کو ہر شعبۂ حیات پر بلا تمیز و تفریق منضبط کرنے کے مغربی فیشن کی غلامانہ نقل کی۔ ارتقاء کا اصول باوجود قریباً ہمہ گیر ہونے کے اپنی حدود رکھتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ حسن کے شاہکار آفرین فنکار کے بعد فن کی روایت ترقی کی بجائے تنزّل کی جانب مائل ہو۔ لہٰذا ہر ارتقائی اقدام کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ترقی کی جانب ہو۔

نیز اخلاقی اور روحانی صداقتوں کے تفحص میں ایک ایسی منزل آجاتی ہے جس سے آگے ترقی ناممکن یا تنزّل کے مترادف ہوتی ہے۔ خدا ایک ہے۔ تمام انسانوں کو برابر اور بھائی سمجھنا چاہیئے۔ سچ جھوٹ سے بہتر ہوتا ہے۔ جنسی معاملات میں وفاداری، بے وفائی اور منافقت سے بہتر ہوتی ہے۔ چوری نہیں کرنی چاہیئے۔ قتل نہیں کرنا چاہیئے۔ غدّاری اچھی نہیں ہوتی۔ خیرات کرنی چاہیئے۔ غرض اس قسم کے کئی زرّیں اصول ایسے ہیں، جن تک پہنچنے کے لیے انسان جادۂ ارتقاء سے ضرور گذرا ہے لیکن جن تک پہنچ کر آگے ارتقاء ناممکن ہو جاتا ہے اور ارتقاء کی کوشش محض اخلاقی تجربہ کی ان منازل کی جانب رجوع کے مترادف ہے، جنھیں نسل انسانی بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ اسلام انہی اخلاقی اور روحانی اصولوں کا آخری بیان ہے، جن میں ارتقاء کے بہانے تغیّر کی کوشش نسلِ انسانی کو اخلاقی اور روحانی تنزّل کی جانب لے جائے گی اور جو اصول ایک دفعہ بیان ہو کر دائمی سچائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دوسرے وہ مذہبی فلسفی ہیں جو اسلامی دنیا کی ہزیمت سے بہت متاثر ہوتے ہیں یہ فلسفی بھی پہلے فرقہ کے فلسفیوں کی طرح مذہب اور دنیوی عناصرِ قوت میں تمیز نہیں کر سکتے اور عناصرِ قوت کی کمزوری کے لازمی نتیجہ یعنی دنیوی ہزیمت کو مذہب اسلام کی کمزوری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ یہ فلسفی اس بات سے بھی بہت متاثر ہوتے ہیں کہ تمام دُنیائے اسلام کو محکوم و مغلوب کرنے والی یورپی اقوام عیسائی ہیں۔ اگر عیسائیت عناصرِ قوت میں سے ہے تو ان مذہبی فلاسفہ کے نزدیک اسلام کی سب سے بڑی کمی عیسائیت کے عنصرِ اعظم یعنی عیسےٰ ابنِ مریم کی طرف توجہ کی کمی ہے۔ اگر اسلام کے اندر ہی عیسےٰ ابنِ مریم دوبارہ زندہ ہوسکیں تو اسلام کی یہ کمی پوری ہوجائے گی اور اسلام عیسےٰؑ کی کمی کو پورا کرکے پھر ترقی کے راستہ پر چل سکے گا۔ اس لیے اسلام میں عیسےٰؑ کی دوبارہ آمد کے جواز پیدا ہوجاتے ہیں اور یہ فلسفی اپنے آپ کو اس مقدّس حیثیت سے پیش کرکے امید کرتے ہیں کہ اب اسلام دوبارہ زندہ ہوجائے گا۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ مذہبی فلسفی جن کی تحت الشعوری کیفیت پہلے بیان کی گئی ہے تہذیب کی درست تشریح کرسکتے تو دنیائے اسلام کے عناصرِ قوت کی کمزوری کے لازمی نتیجہ یعنی ہزیمت کو مذہب اسلام کی عدم تکمیل پر محمول نہ کرتے اور اگر یہ مذہبی فلسفی اسلامی دُنیا کے تنزّل کی درست تشریح کرسکتے اور دُنیوی قوت کی وجوہ کو دیگر عناصرِ تہذیب سے علیٰحدہ کرسکتے تو حکمران اقوام کے مذہب کی بنیاد یعنی عیسےٰؑ کو اسلام میں دوبارہ زندہ کرنے کی بجائے صرف حکمران اقوام کے عناصرِ قوت کے مطالعہ اور حصول کی تلقین کرتے، جن کے مطالعہ اور حصول اور ترقی نے دنیوی طاقت مسلمانوں کے ہاتھ سے یورپ کے ہاتھوں میں منتقل کردی تھی۔ لا نبی بعدی کے بعد اسلام کے اندر کوئی نبی خواہ وہ ظلّی بروزی یا مجازی ہو۔ ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے بعد ظلّی بروزی یا مجازی خدا۔ پیشین گوئیوں کے متعلق نہایت محتاط رہنا چاہیئے۔ کیونکہ عام طور پر ان کے پیش کرنے والے ان کی تاویل کرکے ان سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور پیشین گوئیوں کے پہلے حصّوں کی تاویل کرکے عیسےٰ ابنِ مریم کے ورُود کی پیشین گوئی کو لفظی معنوں میں قبول کرتے ہیں حالانکہ تفسیر کے اصول کے مطابق یا سب حصص کے لفظی معانی لیے

جائیں یا تاویلی۔ اگر پہلے حصص کے تاویلی معانی لیے جائیں تو یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پیشین گوئیوں میں "عیسےٰ ابن مریم" کی بھی تاویل کی جائے۔ عیسےٰؑ کے نزول سے اسلامی دنیا میں عیسائی حکمرانوں اور عیسائی مشنریوں کا ورُود مراد لی جاسکتی ہے یا ان مسلمانوں کی جانب اشارہ سمجھا جاسکتا ہے جو یورپ کے مقابلہ میں اسلامی دُنیا کی شکست سے اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ ان کے دل میں مسیحی یورپ کی تقلید و پرستش کے جذبات موجزن ہیں۔ ہر حالت میں جب کہ پیشین گوئیوں کے باقی تمام الفاظ کی تاویل کی جاتی ہے تو محض عیسےٰ ابن مریم کی تاویل نہ کرنا تفسیری ایمانداری نہیں ہوسکتی۔

نقشہ نمبر ۲ سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ جس طرح وہ مسلمان جو فطرتاً مذہبی واقع ہوئے ہیں لیکن تہذیب کی درست تشریح نہیں کرسکتے۔ وہ مذہب کو ہی عناصرِ قوت سمجھ کر دُنیائے اسلام کی ہزیمت کو مذہب اسلام کی کمزوریوں پر محمول کریں گے اور مذہب اسلام کی تکمیل کے لیے غیر متعلق نسخے تجویز فرمائیں گے۔ اسی طرح وہ مسلمان جو فطرتاً ظاہربین واقع ہوئے ہیں لیکن تہذیب کی درست تشریح نہیں کرسکتے۔ وہ عناصرِ ثقافت کو ہی عناصرِ قوت سمجھ کر دُنیائے اسلام کی ہزیمت کو اسلام کی "فرسودہ" ثقافت پر محمول کریں گے اور وہ اسلامی عناصرِ ثقافت کو ترک کرنے اور یورپ کی حکمران اقوام کے عناصرِ ثقافت کے حصول میں ہی اسلامی دُنیا کی ترقی کو ممکن سمجھیں گے۔

تمام دُنیائے اسلام میں اسلام کی اعلےٰ اخلاقی و ثقافتی اور معاشرتی روایات کو ردّ کرنے اور ان کی بجائے یورپ کی معاشرتی اور ثقافتی روایات کو حاصل کرنے کا عمل اسی طرزِ خیال کا نتیجہ ہے۔ یہ عمل ترکی اور ایران میں حکمرانوں کے تشدّد سے قومی حیثیت اختیار کرچکا ہے لیکن حکومت کے تشدّد سے پہلے بھی انفرادی طور پر دماغی غلامی اور تشریحی غلطی کے باعث مشروع ہوچکا تھا اور اس وقت بھی عربی اور مشرقی اسلامی ممالک تہذیب کی غلط تشریح کے اثر کے ماتحت یورپ کی ثقافتی اور معاشرتی تقلید کی رَو میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہتے چلے جا رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ مسلمان یورپ سے صرف ان عناصرِ قوت کو حاصل کرلیں جن کے حصول سے اور جن کی ترقی سے یورپ نے دُنیائے اسلام کو غلام بنالیا ہے[1]۔ مسلمان تشریحی مغالطہ کے ماتحت یورپ کے عناصرِ ثقافت کو ہی عناصرِ قوت سمجھ کر حاصل کر رہے ہیں اور اسے خدمتِ اسلام تصوّر کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس نقل کی تحریک کے ماتحت مسلمان ہیٹ، سوٹ، شراب خوری، خنزیر خوری، بے پردگی، ناچنا، گانا، جنسی بے ضابطگیاں وغیرہ سب کو عناصرِ قوت سمجھ کر اسلامی ثقافت کا حصّہ بنا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ سب اشیاء یورپ کی اقوام کے مذہبی اور معاشرتی عناصر ہیں، ان کی دنیوی قوت اور سیاسی فتح کے باعث نہیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ دُنیائے اسلام کی بقاء کے لیے صنعتی ترقی اور اقتصادی تنظیم لازمی امور ہیں۔ ہم بہ حیثیت غریب گاہک یا متمول دکان دار اسلامی صنعت کی سرپرستی کر سکتے ہیں لیکن منظم مقابلہ کے سامنے کوشش اگر من حیث القوم ہو تو زیادہ بار ور ہوتی ہے اور صنعت اتنی پیچیدہ ہوگئی ہے کہ اس کے ابتدائی ترین مدارج تک ہم صرف قومی کوشش سے ہی پہنچ سکتے ہیں۔

قومی کوشش چھوٹے پیمانہ پر اشتراک سرمایہ صنعتی درسگاہوں اور مُشترکانہ سرپرستی کی صورت اختیار کرے گی۔ لیکن ایک قوم اس وقت تک پوری صنعتی ترقی نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس کا قومی جغرافیائی حدود اور ان حدود پر حاصل درآمد پر قبضہ نہ ہو۔ جب تک ایک قوم کی ابتدائی صنعت کو زبردست حاصل درآمد سے امداد نہ مل سکے گی، بیرونی ترقی یافتہ صنعت اس کو مقابلہ سے تباہ کر دے گی اور وہ قوم عناصرِ قوت سے محروم رہ کر مغلوب و محکوم ہو جائے گی۔ آئندہ دُنیا کی سیاسی تاریخ آزادی غلامی اور سلطنت کے فیصلے انسانی تعداد سے زیادہ صنعتی ترقی پر مبنی ہوں گے۔

[1] آج کل "بنا لیا تھا" زیادہ صحیح ہوگا۔ (۱۹۷۰ء)

حکمران قوم محکوموں کی صنعتی ترقی کو تباہ کر دے گی اور صنعتی ترقی کو صرف اپنے قبضہ میں رکھنے کی کوشش کرے گی۔ دشمنوں کی صنعتی ترقی کی بربادی جنگ میں بہترین ہتھیار ہوگا۔

افغانستان، ایران، ترکی، حجاز اور مصر[1] کو جغرافیائی حدود اور حاصل درآمد پر پورا قبضہ حاصل ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان ممالک کے اکثر باشندے تہذیب کی غلط تشریح کے ماتحت لباس کے تغیّرات اور یورپ کی غیر ضروری معاشرتی تقلید میں ہی عناصرِ قوت کے اسرار ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اسلامی ممالک کی قوت مدافعت صرف ان کی صنعتی ترقی پر منحصر ہوگی نہ کہ لباس کے تغیّرات اور یورپ کی معاشرتی تقلید پر۔ یورپ کے ثقافتی عناصر کے حصول سے یورپ کی اس دنیوی طاقت کا مقابلہ نہیں ہو سکتا جو یورپ کو صنعتی ترقی اور اقتصادی تنظیم سے حاصل ہے بلکہ یورپ کی معاشرتی زندگی کے عیوب یورپ کی خیرہ کُن سیاسی کامیابی کے پیچھے چھُپ گئے ہیں اور یہ کامیابی یورپ کو صنعتی ترقی کے ذریعے حاصل ہوئی ہے۔

ہمیں ایمانداری سے اس امر کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ہم عناصرِ قوت کے حصول و ارتقاء میں یورپ سے بہت پیچھے ہیں۔ یہ سمجھ لینا کہ ہم مذہبی ارتقاء کے متعلق گفتگو کرنے سے یا سوٹ ہیٹ پہننے یا ناچنے گانے سے یورپ کے برابر آجاتے ہیں، اس عظیم الشان

[1] ۱۹۳۴ء میں جب یہ مقالہ پڑھا گیا، اس وقت یہی اسلامی ممالک آزاد کہے جا سکتے تھے۔ آج انڈونیشیا سے مراکش تک اسلامی ممالک سیاسی طور پر آزاد کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن چینی سنکیانگ میں مسلمان نوّے فیصد ہیں مگر سیاسی اہمیت نہیں رکھتے۔ روسی ترکستان کے مسلمان روس کی سیاسی و ثقافتی بالادستی سے لاچار ہیں۔ ان کے حالات کے لیے پڑھیئے :-

ALEXANDRE BENNIGSEN & LEMERCIER-QUEL-QUEJOY : ISLAM IN SOVIET RUSSIA.
(PAK MALL PRESS : LONDON)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ دوم

صنعتی اور اقتصادی ترقی کا مذاق اڑانا ہے جس میں یورپ کو ہم پر وہ فوقیت حاصل ہے جو یورپ کی عالمگیر فتح اور اسلامی دنیا کی ہمہ گیر شکست کا باعث ہوئی۔ اسلامی دنیا کی جہد للبقاء کے لیے سب سے بڑی ضرورت یورپ کی قوت کے اصلی عناصر یعنی صنعتی ترقی اور اقتصادی تنظیم کا حصول ہے جس کے لیے درست عناصرِ قوت کا احساس اور ان کے حصول کے لیے درست کوشش درکار ہے۔

مقالہ سوم

پردہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ سوم

اس باب اور آئندہ ابواب میں میرا مقصد ان غلط فہمیوں کا بیان کرنا ہے جو تمدّنِ اسلامی کے متعلق مذکورہ تشریحی غلطیوں کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔

ہماری دنیوی ہزیمت کے بعد سب سے بڑی غلط فہمی جو اسلامی تمدّن کے متعلق پیدا ہوئی، وہ اسلامی دُنیا کی عورتوں سے روا رکھی سلوک کے متعلق تھی۔ مسلمانوں کی کم علمی کا احساس رکھتے ہوئے اور عیسویت کی تبلیغی کوشش کی امداد کی نیت سے مغربی مصنّفین نے اسلام کے متعلق اس قسم کی غلط فہمیوں کے پھیلانے میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ تشریح کی آسانی مدّ نظر رکھتے ہوئے اس مضمون کو دو حصّص میں منقسم کر دینا مناسب ہوگا۔

اوّل پردہ۔ دوم کثیر الازدواجی۔ یہ دونوں مضامین درحقیقت واحد مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مطلب کو بالکل واضح کرنے کے لیے ان مضامین میں "کثیر الازدواجی" سے ایک مرد کے کئی عورتوں سے جنسی تعلقات کا مطلب لیا جائے گا اور ایک عورت کے کئی مردوں سے تعلقاتِ جنسی کے لیے "پولی اینڈری" کی مغربی اصطلاح استعمال کی جائے گی۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ موجودہ زمانے میں ہماری سوسائٹی کا پردہ کو چھوڑنے کی طرف میلان اسلامی دنیا کی عظیم الشان ہزیمتوں کے بعد عناصرِ قوت کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غلط تشریح کے باعث شروع ہوا ہے۔ موجودہ حالات[1] میں حکمرانوں کی نقل کی طرف میلان چنداں حیرت انگیز واقعہ نہیں۔ اسلامی حکومت کے اثر سے شمالی ہندوستان میں کئی غیر مسلم خاندانوں نے بھی پردہ شروع کر دیا تھا۔ جو آج تک کئی اعلےٰ ہندو گھرانوں میں قائم ہے۔ اندلسی خلافت کے زمانہ میں ہسپانوی عیسائی عربی لباس پہنتے تھے اور ہسپانوی سفید رُو عورتیں ایسا غازہ استعمال کرتی تھیں، جس سے ان کے چہروں کا رنگ بھی حکمران عربوں کی عورتوں کے چہروں کے رنگ کی طرح خوشنما ہو جائے۔ اس نقل کے پیچھے حکمرانوں کی معاشرتی برابر مقصود ہوتی ہے۔ اگر موجودہ حکمران اقوام میں پردہ کا رواج ہوتا، تو مسلمان پردہ چھوڑنے کی طرف ہرگز مائل نہ ہوتے اور وہ دلائل جو آج پردہ کے خلاف محض محکومانہ نقل کو باعزت بنانے کے لیے سوجھ رہے ہیں شاید خیال میں بھی نہ آتے۔ صدیوں مسلمان سلطنتوں میں محکوم بے پردہ اقوام آباد رہیں لیکن اس وقت مسلمانوں کو پردہ کے خلاف شدید مخالفت کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور اگر "عورتوں کی قید" یعنی پردہ مسلمانوں کے موجودہ تنزّل کا باعث ہے تو انہوں نے بے پردہ قوموں کو ایک ہزار سال سے زیادہ مدّت تک کس طرح محکوم و مجبور بنائے رکھا؟

تیرہ سو سال تک مسلمان دنیا کی تاریخ سازی میں یورپ کے مدّمقابل رہے ہیں۔ اگر موجودہ فاتح یورپ کے آتش انتقام سے دہکتے ہوئے دل میں ہماری تہذیب کی جانب بغض و حقارت کا جذبہ ہو تو یہ باعثِ تعجّب نہیں۔ دنیا میں کامیابی اعلیٰ ترین دلیل سمجھی جاتی ہے۔ مغلوب موردِ حقارت ہوا کرتے ہیں۔ یہ حقارت جو ہماری روایات کے متعلق ظاہر کی جاتی ہے، ہمارے موجودہ سیاسی حالات کا نتیجہ ہے اور اُن مذاہب کا ہتھیار ہے جو اسلام کی وسیع دُنیا کو اپنی مادّی و رُوحانی وراثت بنانے کی امید رکھتے ہیں۔

[1] یہ مقالہ پہلی دفعہ جب پڑھا گیا، اس وقت اکثر مسلمان سیاسی طور پر یورپ کے ماتحت تھے۔ اس مقالے میں بہت سے اضافے بعد میں یورپ میں کیے گئے۔

اظہارِ حقارت کو دوستانہ مشورہ خیال کرنا قومی خودکشی کے مترادف ہوتا ہے۔ اسلام کے متعلق صریح غلط بیانیوں سے لبریز پروپیگنڈہ یورپ کے ہر گوشے میں پھیلا ہوا ہے ہمارے رسول مقبولؐ، ہماری شریعت، ہمارے لباس و رسوم تک کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم یورپ کی حقارت کو دلیل بنا کر آخر کس کس روایت کو ترک کر دیں گے؟ یہ فاتحین کا دستور ہے کہ وہ محکوم اقوام کی معاشرت اور تہذیب و تمدّن کا مذاق اُڑائیں لیکن مفتوحین کا فرض ہے کہ وہ اپنے دماغی توازن کو سنبھالے رکھیں۔ اگر اپنے مذہب و معاشرت کے خلاف اظہارِ حقارت کرنے میں ہم بھی حریفوں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے تو کسی دن ہماری قوم کا نام دُنیا سے محو ہو جائے گا۔

غالباً اس جگہ یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ نکاح، جائیداد اور زندگی کے دیگر معاملات میں اسلام نے عورت کو اس وقت سے حقوق عطاء کیے ہوئے ہیں، جب کہ دوسرے مذاہب میں عورت کا درجہ غلام سے بدتر تھا۔ اسلام میں عورت مرد کی ملکیت نہیں ہے مسلمان عورت اپنے خاوند کی طرح خدائے واحد کی عبادت کرتی ہے۔ اُسے خاوند کو خدا سمجھ کر پُوجنے کا حکم نہیں ہے جیسا کہ دوسرے مذاہب میں ہے۔ نہ اس کو خاوند کی موت پر زندہ آگ میں جلا کر ستی کرنا اسلام میں جائز ہے۔ اس کو مرد کی طرح اقتصادی و معاشرتی و مذہبی و روحانی حقوق حاصل ہیں۔ انگلستان میں عورت جائیداد رکھنے کا حق صرف پچھلی صدی میں حاصل ہوا ہے۔

یونان، شام، ایران اور عرب میں اسلام سے قبل بھی پردے کا رواج تھا۔ ایرانی حرم میں تو "پردہ اس قدر شدّت سے تھا کہ نرگس کے پھول بھی محل کے اندر نہیں جا سکتے تھے کیونکہ نرگس کی آنکھ مشہور ہے"۔

اسلام سے پہلے بھی جہاں جہاں عورت کی عصمت و پاکیزگی کی حفاظت کی ضرورت محسوس ہوئی پردہ کے اصولوں کو عمل میں لایا گیا۔ لیکن اسلام سے پہلے عورت کی پاکیزگی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ ایسی عام معاشرتی خصوصیت نہ تھی۔[1] یہ پردہ محض اس لیے رائج نہیں کیا گیا تھا کہ حوّا کی بیٹی کو اس کی ماں کے گناہوں کی سزا دی جائے۔ اسلام اجازت دیتا ہے کہ عورت اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے اپنے چہرے کو چھپا لے۔ پردہ محض ذریعہ ہے، مقصد عصمت کی حفاظت ہے۔ اگر کوئی عورت اپنا منہ ڈھانپنا چاہے تو اس کو پوری آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ ڈھانپ لے۔ اس پر دوسری اقوام یا مسلمانوں کو مضطرب ہونے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

اگر عصمت کوئی قابلِ قدر صفت نہیں ہے تو اس کی حفاظت بے معنی ہے۔ لیکن اگر عصمت واقعی ایسی صفت ہے کہ اس کی قدر کی جائے تو مناسب ہوگا کہ ہم ایسی اقوام کے جنسی حالات کا مطالعہ کریں جو پردہ نہیں کرتیں اور دیکھیں کہ بے پردگی میں عصمت کہاں تک محفوظ ہے؟ علمی تشریح کو محض جذباتی بیان پر ہمیشہ ترجیح دینی چاہیئے۔

صرف انگلستان میں ناجائز اولاد کی پیدائش بتیس ہزار فی سال ہے[2]۔ اگر ویلز، سکاٹ لینڈ، شمالی آئرلینڈ و جزائر کو بھی شامل کر دیا جائے تو تعداد قریباً ساٹھ ہزار ہوگی۔ اس ضمن میں حسب ذیل امور قابلِ غور ہیں۔

۱:۔ ہر جنسی تعلق بچہ کی ولادت پر منتج نہیں ہوتا۔ کئی وقعہ نصف صدی کی ازدواجی زندگی میں صرف چار پانچ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ امریکہ میں تیرہ فیصد شادی شدہ جوڑے بے اولاد ہوتے ہیں۔ فطرت میں تضیعِ تخم بہت زیادہ ہے لیکن باوجود اس کے جب ناجائز اولاد کی مندرجہ بالا تعداد سرکاری کتب میں درج ہوئی ہے اور آپ اس سے ناجائز تعلقات

---

[1] پڑھیئے:- BURGO PARTRIDGE: A HISTORY OF ORGIES (1958) سنہ ۱۹۷۰ء

[2] مطبوعہ سنہ ۱۹۶۶ء کے R.S. MORTON: VENEREAL DISEASES صفحہ نمبر ۱۱۳ پر سنہ ۱۹۶۳ء میں صرف انگلستان اور ویلز میں ناجائز بچوں کی تعداد اُنسٹھ ہزار درج ہے یعنی سکاٹ لینڈ اور شمالی آئرلینڈ کو ملا کر قریباً اسّی ہزار ہوگی۔

کی تعداد کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۲:۔ ناجائز اولاد کو روکنے کے لیے آلات مانع الحمل لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ہر سال استعمال ہوتے ہیں۔

۳:۔ شادی شدہ عورت کی اولاد ہمیشہ خاوند کی اولاد سمجھی جاتی ہے اور ناجائز شمار نہیں ہوتی۔ لہٰذا ناجائز اولاد کی مندرجہ بالا تعداد غیر شادی شدہ و کنواری عورتوں کی اولاد کی ہے۔

۴:۔ کئی بچے پیدائش سے پہلے ہی ہلاک کر دیئے جاتے ہیں اور بقول کارساندرس (دُنیا کی آبادی۔ مطبوعہ آکسفورڈ) یہ عمل انگلستان اور جرمنی میں بہت عام ہے۔

جب مندرجہ بالا چار باتوں کے باوجود انگلستان کے محکمہ پبلک ہیلتھ کے سرکاری کاغذات میں ساٹھ ہزار ناجائز بچے ہر سال درج ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یورپ کی معاشرت میں جنسی اخلاق کی کیا حالت ہے۔ ظاہر ہے کہ یورپ کے جنسی تعلقات میں وہ سادگی نہیں جو شادی کو پردہ کی امداد سے حاصل ہوتی ہے۔ یورپ میں جنسی تعلقات کی پیچیدگی جو مندرجہ بالا حالات سے ظاہر ہے کثیر الازدواجی اور پولی اینڈری دونوں ہی قسم کے جنسی تعلقات بیک وقت پیدا کر دیتی ہے۔ گو قانون اور مذہب کے خوف سے ظاہریت میں آبادی صرف شادی شدہ جوڑوں اور غیر شادی شدہ انسانوں پر مشتمل معلوم ہوتی ہے۔ ان حالات میں قریباً ہر مغربی عورت جھوٹ اور منافقت کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوتی ہے اور ان حالات میں مغربی مصنفین کا پردہ اور اسلام کی محدود کثیر الازدواجی پر زہر اُگلنا اور اپنے ممالک کی معاشرتی حالت کو عمداً نظر انداز کرنا مسلمانوں کو جان بوجھ کر بے وقوف بنانے کے مترادف ہے۔

یہ بھی غلط ہے کہ ان معاملات میں مشرق و مغرب کے عقیدے میں فرق ہے عیسائیت مرد اور عورت کی عصمت پر قریباً اتنا ہی زور دیتی ہے جتنا کہ اسلام۔ مغرب کے لاکھوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کلیساؤں میں عیسائیت کی لاکھوں مجلسوں میں جنسی پاکیزگی کی تلقین ہوتی ہے۔ خدمتِ خلق کی انجمنیں، سکول۔ یونیورسٹیاں اور حکومتیں سب اس امر کی ضرورت پبلک کو یاد دلاتی رہتی ہیں[1]۔ کیونکہ ایک قوم کی دنیوی و روحانی فلاح و بہبود کے لیے ایماندارانہ شادی، ازدواجی وفاداری اور جنسی ضبط نہایت ضروری امور ہیں اور مغربی لوگ ان اصولوں کی قدر و قیمت سے آشنا ہیں۔ لیکن وہ اپنے آپ کو پردہ پر آمادہ نہیں کر سکتے اور چونکہ یہ ان کے پرانے فاتحین مسلمانوں کی روایت ہے۔ لہٰذا قابل نفرین و حقارت ہے۔

ڈاکٹر برگ[2] ڈورفر کی تحقیقات کے مطابق برلن میں دانستہ اسقاط الحمل کی تعداد اور جائز و ناجائز پیدائش میں ایک سو تین اور سو کی نسبت ہے۔ ڈاکٹر لاوری اپنی کتاب ہرسیلف (مطبوعہ فاربس اینڈ کمپنی) میں قبل از پیدائش بچوں کے قتل کی تعداد ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پندرہ لاکھ فی سال بتاتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ ڈاکٹر ریمنڈ پرل کے اعداد و شمار کے مطابق آلاتِ مانع الحمل کا استعمال اسی ملک کی سفید عورتوں کے غریب طبقوں کے مقابلے میں ۳۲۶۷ فیصد سے بڑھ کر متموّل طبقوں میں ۸۶۳ تک پہنچ جاتا ہے۔ پیرس کی سوربون یونیورسٹی کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر لاکا سائن کے حساب سے فرانس میں ہر سال ساڑھے آٹھ لاکھ (۸۵۰۰۰۰) جائز و ناجائز پیدائشوں کے مقابلے میں پانچ لاکھ بچے مجرمانہ اسقاط الحمل (CRIMINAL ABORTION) سے ضائع کیے جاتے

---

[1] انقلابِ روس کے ایامِ اوائل میں کمیونسٹ حکومت نے تمام ملک میں آزاد جنسیت رائج کر دی تھی۔ مگر تجربے نے بہت سے خیالی نظریئے بدل دیئے ہیں۔

LUNDBERG & FARNHAM (MODERN WOMEN)

کے مطابق ۱۹۳۶ء سے "روسی پروپیگنڈہ خاندانی منظم زندگی کے حق میں اتنا ہی تیز ہے جتنا رومن کیتھولک عیسائیوں کا۔"

[2] CARR SAUNDERS: THE WORLD POPULATION

ہیں۔ برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن کی ایک کمیٹی نے جو ان معاملات کی تفتیش کے لیے قائم کی گئی تھی ۱۹۳۶ء میں اپنی رپورٹ مرتب کی، جس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ تمام جائز و ناجائز پیدائشوں کی تعداد کے قریباً بیس فیصد کے برابر تعداد کو مجرمانہ اسقاط الحمل سے برباد کر دیا جاتا ہے۔ ناروے و سویڈن کے صحت کے محکموں کی کمیٹیاں قریباً انہی نتائج پر پہنچی ہیں۔ ڈاکٹر ایڈن نے سویڈن میں اس قسم کے معاملات پر تفتیش کر کے دریافت کیا کہ ۱۹۳۰ء میں سویڈن میں جائز و ناجائز پیدائشیں ۹۴۲۲۰ تھیں اور اسقاط الحمل کی تعداد جو اکثر مجرمانہ تھا ۱۰۴۴۵ تھی۔ سویڈن کے ڈاکٹر ڈالبرگ کا خیال ہے کہ لوگ عام طور پر ناجائز اولاد کی ایک تہائی کو اسقاط الحمل کے ذریعے ضائع کر دیتے ہیں۔

غرض یورپ میں شادی ایک کامیاب ادارہ نہیں ہے اور اپنے مقاصد یعنی عورت اور مرد کو تمام عمر آپس میں وفادار رکھنے اور غیر شادی شدہ عورت کی عصمت کو محفوظ رکھنے میں کامیاب نہیں ہوئی، بلکہ شادی کی تقدیس اور عصمت کی منافقت کو قائم رکھنے کے لیے لاکھوں بے گناہ بچے مجرمانہ اسقاط الحمل کے ذریعے ضائع کر دیئے جاتے ہیں باوجود اس کے کہ آلات مانع الحمل بھی بکثرت مستعمل ہیں۔ یورپ کی آبادی کے بتدریج تنزّل کی ایک وجہ یہ جنسی حالات بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قومی آبادی کو گھٹتا ہوا دیکھ کر کئی یورپی سیاستدان شادی اور عصمت کے متعلق قدیم روّیہ کو بالکل تبدیل کر دینے کے حق میں ہیں۔ مذہبی ہدایت اور سیاسی و قومی ضرورت کے باوجود یورپ میں پردے کے بغیر شادی کی تقدیس اور عصمت محفوظ نہیں۔ جو حضرات پردہ کے مخالف ہیں اُن کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ یورپ کے جنسی حالات کی علمی تفتیش کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچیں۔ روایات کی یاد شاید ایک نسل کو نیک اور شریف رکھے لیکن دوسری تیسری نسل میں یہی یورپی حالات ہماری معاشرت کا دائمی حصّہ بن جائیں گے۔ اسلام کوئی جادو منتر نہیں کہ بلا محکم یقین اور مناسب عمل کے اخلاقی بلندی کا ضامن رہے۔ جن ممالک نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موجودہ زمانے میں پردہ ترک کیا ہے، اُن کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اِن ملکوں میں عورت سے پردہ کرسکنے کی آزادی قانوناً چھن چکی ہے۔ نتیجہ یہ کہ جو خرابیاں اس سے پہلے آبادی کے ایک حصے تک مخصوص تھیں اب عام ہو چکی ہیں۔

پردے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پردے کی صورت میں آزاد محبّت کی اجازت نہیں ہوتی۔ مندرجہ بالا ناجائز اولاد اور حمل مانع اسقاط الحمل کے اعداد و شمار اسی آزاد محبت کا نتیجہ ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ حالات پہلے سے زیادہ خراب ہو گئے ہیں لیکن ناجائز اولاد کے اُن اعداد و شمار سے جو ہیرلڈ کاکس نے اپنی کتاب "برائلم آف پاپولیشن" یعنی "مسئلہ آبادی" میں درج کیے ہیں، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تعداد صرف انگلستان میں پچھلی صدی کے نصف حصّے میں تقریباً چھیالیس ہزار فی سال تھی یعنی تمام برطانیہ میں کوئی نوّے ہزار ہوگی۔ اس بڑی تعداد کی کچھ وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ اس وقت عیسائی مذہب کی زبردست مخالفت کی وجہ سے طلاق کا اسلامی قانون انگلستان میں ابھی نافذ نہیں ہوا تھا۔

مندرجہ بالا حالات سے ظاہر ہے کہ مغرب میں عورت پردہ کی پابندیوں سے آزاد ضرور ہے مگر خوش نہیں ہے۔ اس کو جنسی تعلقات میں وہ استقلال نصیب نہیں ہے جو مسلمان پردہ دار بیوی اپنے خاوند کے دل پر اعتبار جما کر حاصل کر لیتی ہے۔ مغربی معاشرت میں پردہ رائج نہ ہونے کی وجہ سے عورت سوسائٹی میں نمائش کی غرض سے انتخاب کی جاتی ہے۔ حسن اخلاق و سیرت ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز شادی کے بعد بھی بے پردہ سوسائٹی میں عورت کا مقابلہ عورت سے اور مرد کا مقابلہ مرد سے قائم رہتا ہے۔ ہر شکل و صورت کے مرد و عورت کو جو اطمینان اور خوشی کی زندگی بسر کرنے کے امکانات اسلامی معاشرت میں پردہ کی وجہ سے حاصل ہیں شاید کسی اور معاشرت میں میسّر نہیں۔

یہ چنداں حیرت کی بات نہیں ہے کہ دُنیا میں کسی قوم میں اتنی کامیاب شادیاں نہیں

ہوتیں جتنی کہ مسلمانوں میں۔ کیونکہ مسلمانوں کی پردہ دار معاشرت میں جنسی محبّت اسلامی نکاح کے مقدس ماحول میں شروع ہوتی ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے یہ بات جذباتی تعصّب نہیں۔ غالباً یہ بیان کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اخباری بیانات کے مطابق انگلستان میں ہر وقت پندرہ ہزار سے پچیس ہزار تک طلاق کے مقدمات عدالتوں میں معلّق رہتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر مقدمات خاوند اور بیوی کی جنسی بے وفائی کی بناء پر دائر کیے جاتے ہیں۔ جج لنڈسے کی کتاب "ریوولٹ آف ماڈرن یوتھ" یعنی "بغاوتِ شباب" کے مطابق ہر سال امریکہ میں اتنی ہی طلاقیں ہوتی ہیں جتنی شادیاں۔ اور یہ اُن لاکھوں "علیحدگیوں" کے علاوہ ہیں جو قانونی صورت اختیار نہیں کرتیں۔ ظاہر ہے کہ آزاد عشقیہ شادیاں ازدواجی وفاداری، محبّت اور استقلال کی ضامن نہیں بن سکتیں۔ جب حسن یا جذبۂ عشق ہی نکاح و شادی کی بنیاد ہو تو حسن کے تغیّر یا جذبۂ عشق کے بدل جانے کے بعد وفاداری کی کوئی اور وجہ باقی نہیں رہتی۔ ہر انسان کا عشق کے قابل ہونا محض جذباتی گفتگو ہے اور دائمی عشق بہت نادر واقعہ ہے۔ خود ان شعراء کی زندگیاں جنہوں نے مغربی ادب میں دائمی محبّت کے گیتوں اور افسانوں کا اضافہ کیا ہے۔ مختلف عورتوں سے بد عہدی اور دیگر جنسی جرائم کی تاریخیں ہیں۔ مشرقی روایات کے مطابق ایسے جذبے کے لیے جس کا نتیجہ معاشرہ میں مغرب کی طرح جنسی بدنظمی، جنسی امراض، بڑی تعداد میں اسقاط الحمل اور بے انتہا طلاقیں ہوں "عشق" اور "محبت" کے مقدّس الفاظ استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ مغربی "آزاد عشق" یا "آزاد محبّت" میں آزادی بمعنی خوشوقتی، دروغ گوئی، یا غیر ذمہ دار فلرٹیشن کے ہوتی ہے جس کا اکثر نتیجہ بلا نکاح جنسی تجربہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ مغربی معاشرت کی حالت سے ظاہر ہے۔ مشرق میں ایسے جذبے کو عشق یا محبت کہنا مذاق سا معلوم ہوتا ہے۔ مشرق میں شاید اسے "آزاد ہوس پرستی" کہنا زیادہ مناسب ہو۔ نیز بے پردہ معاشرت میں جہاں ایک سوسائٹی کے اندر ہر انسان ایک دوسرے کو دیکھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور مل سکتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ جس کے لیے ایک انسان کے دل میں جذبۂ محبت پیدا ہو وہ کسی دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو۔ ان حالات میں عشق محض جنسی بدنظمی کا جواز بن سکتا ہے۔ لہٰذا شادی کی بقاء کے لیے احساس فرض کے علاوہ عورت کی عفت اور مرد اور عورت کے میل جول کی مناسب تنظیم لازم ترین شرائط ہیں اور یہ اسلامی نکاح اور پردے سے بمقابلہ کسی اور ذریعے کے بطرز احسن پوری ہو سکتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ پردے کی رکاوٹ خواہش کو بھڑکاتی ہے اور اس طرح بدی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ مگر کیا لوگ اس لیے جرم کرتے ہیں کہ جرائم کے خلاف قوانین کی رکاوٹ ہے؟ یا قوانین اس لیے بنائے گئے تھے کہ جرائم کی روک تھام کی جائے؟ کیا جرائم کے خلاف تمام رکاوٹی قوانین کی تنسیخ قومی زندگی کو جرائم سے پاک کر دے گی؟ امریکہ میں شراب خوری کے خلاف تمام قانونی بندش کے ختم ہوتے کے بعد شراب خوری میں اندھا دھند اضافہ ہو رہا ہے۔ ساغر و مینا کی الماری کھول دینا تو بہ شکنی کا بندوبست کرنا ہے۔ محض گفتگو کی رونق کے لیے معقولیت کو قربان کرنا مناسب نہیں ہوتا۔

حریفوں کا اعتراض ہے کہ مسلمان ضمیر پر اعتماد نہیں کرتے۔ محض جبر پر اعتماد کرتے ہیں۔ لیکن دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جس میں قوانین تعزیرات اور دوسرے قوانین رائج نہ ہوں۔ مہذب ممالک میں ادنیٰ اشیاء کی چوری کے معاملے میں قوانین، پارلیمنٹوں، عدالتوں، سپاہیوں، ہتھکڑیوں اور قید خانوں کی ضرورت محسوس کیے جانے سے صاف عیاں ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی محض ضمیر پر مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور انسانی ضمیر قانون و تعزیر کی امداد کا محتاج ہے۔ پردہ ضمیر کی امداد ہے، ضمیر کا بدل نہیں ہے۔ جس طرح قتل کے خلاف قوانین کی موجودگی میں تمام قتل بالکل بند نہیں ہو جاتے لیکن اس بہانے سے قتل کے خلاف تمام قوانین کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح پردہ کا مکمل سو فیصد کامیاب نہ ہو سکنا اس کے منسوخ

کر دینے کے حق میں دلیل نہیں ہے۔

بے پردہ معاشرت میں مخلوط جنسی تعلقات نہ صرف اخلاقی پہلو رکھتے ہیں بلکہ نسل انسانی کے لیے دیگر قبیح اثرات بھی پیدا کرتے ہیں۔ امریکہ کے ڈاکٹر بیکر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آتشک زدہ لوگوں کی تعداد تیس لاکھ بتاتے ہیں جو صحتیابیوں کے باوجود ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ڈاکٹر ٹامس پرآن کے مطابق اس میں سے صرف پچیس فیصد مرض پیشہ ور عورتوں کی وجہ سے پھیلا ہوا ہے۔ باقی پچھتر فیصد مرض کی ذمہ دار نام نہاد شریف خواتین ہیں۔ "مین ہڈ اینڈ میرج" یعنی "شباب و شادی" (مصنفہ میک نیڈن۔ امریکہ) میں تیس سال کی عمر کے مردوں میں سے پچھتر اور نوّے فیصد کے درمیان تعداد اس مرض کا شکار بتائی گئی ہے۔ اسی مستند کتاب میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تمام امراض پوشیدہ کے مریضوں کی تعداد ایک نسل کی کل آبادی کا نوّے فیصد درج ہے۔ ڈاکٹر ولیم سن کے مطابق انگلستان کی نصف آبادی اسی قسم کے امراض قبیحہ کا شکار ہے۔ فرانس میں پانچ لاکھ بچے ایک سال کی عمر کے اندر اندر اس لیے ضائع ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے والدین جنسی امراض قبیحہ کے شکار تھے۔ "مائن کامف" میں ہٹلر جرمن نسل کی اس غارت گری کی طرف دردناک اشارات کرتا ہے جو بداخلاقی اور امراض جنسی کے ہاتھوں ہو رہی ہے[1]۔

ظاہر ہے کہ امریکہ اور یورپ کے مصنفین و مبلغین جو عام طور پر اپنے ممالک کے حالات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں، جب مسلمانوں کو پردہ کے متعلق شرمسار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کا مقصد محض خدمت و دوستی نہیں ہو سکتا۔ اگر مسلمان اپنی روایتی اخلاقی پاکیزگی اور جنسی صحت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے پردہ سے

[1] اسی لیے ہٹلر نے عورتوں کو گھر سے باہر کے دفتری اور تجارتی کام چھوڑ کر گھروں میں واپس لوٹ جانے کا حکم دیا تھا۔ اسی لیے مسولینی کے فاسستی پیروؤں کے نزدیک بچے، باورچی خانہ اور کلیسا عورت کے لیے مکمل اور مناسب دلچسپی کا باعث ہونے چاہئیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شرمانے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ بے پردہ سوسائٹی کو پردہ کے محاسن سے آگاہ کرنا بہترین خدمتِ خلق ہے۔ فضول غیر علمی بحثوں کی بجائے اصل حالات کے صحیح مطالعہ سے ہی ہم درست نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔ محض جذبات تمام بحث میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اور مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کو اپنی حدّت سے منوّر کر سکتے ہیں۔

چند حضرات نے ایک نئی اصطلاح "اسلامی پردہ" ایجاد کی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اگر عورتیں ہاتھ اور منہ ننگا رکھیں تو اسے بھی "پردہ" تصوّر کر لینا چاہیئے۔ جس حدیث سے یہ جواز حاصل کیا جاتا ہے اس میں محرم و نامحرم کی تخصیص نہیں ہے یعنی محرموں کے سامنے بھی اس سے زیادہ حصّۂ جسم ننگا کرنا مناسب[1] نہیں۔ یہ اشارہ اس پردہ پر نہیں ہے جو صرف نامحرموں سے واجب ہے اور آنکھیں نیچے رکھنے کے حکم کی تعمیل عورت پر پردہ کے اندر بھی واجب ہے۔ مناسب یہی ہے کہ عورت جب نامحرم مرد سے دوچار ہو تو برقعہ کے اندر بھی آنکھیں نیچی کرے۔ مگر کیونکہ اس مضمون میں اسلامی روایات کو صرف دلائلِ عقلی و علمی پر ہی مبنی کیا ہے۔ اس[2] لیے اس جگہ یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ یہ نام نہاد "اسلامی پردہ" چنداں کارگر ثابت نہیں ہوا۔ یورپ کے اکثر ممالک میں سردی اس قدر

---

[1] حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں اپنے بھتیجے عبداللہ بن الطفیل کے سامنے زینت سے آئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو ناپسند فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ تو میرا بھتیجا ہے۔ (یعنی محرم ہے) حضورؐ نے فرمایا:۔

"جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے جسم میں سے کچھ ظاہر کرے سوائے چہرے کے اور سوائے اِس کے۔" یہ کہہ کر آپؐ نے اپنی کلائی پر اس طرح ہاتھ رکھا کہ آپؐ کی گرفت کے مقام اور ہتھیلی کے درمیان صرف ایک مٹھی بھر جگہ باقی تھی۔ (از "پردہ" مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

[2] اس مسئلہ پر قرآن کریم و حدیث نبویؐ کے احکام کے لیے کتاب "کشف التفات من مسئلۃ الحجاب" (مصنفہ الحاج مولانا کریم بخش صاحب) مطالعہ فرمائیں۔

ہے کہ تمام عورتیں سوائے چہرے کے باقی جسم کو ڈھانپے رہتی ہیں۔ لیکن متذکرہ بالا اخلاقی گلکاریاں اس قسم کے "اسلامی پردے" کے باوجود ظہور میں آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ لفظ "پردہ" جب تک اپنی تعریف میں چہرہ اور تمام زینتوں کو چھپانا شامل نہ کرے، اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور جہاں تک مجھے علم ہے گو یہ امر بحث سے قریبی تعلق نہیں رکھتا تمام اسلامی تاریخ میں حکماء و شرفاء و عوام پردہ میں چہرہ چھپانے کو شامل سمجھتے رہے ہیں۔ اگر جنگ حدیبیہ میں مسلمان عورتوں نے بے پردہ ہو کر کفّار کا مقابلہ کیا اور اُن کو شکست دی تو یہ پردہ ترک کرنے کا جواز نہیں کیونکہ جنگ میں تو قتل کرنا بھی جائز ہوتا ہے۔

پردہ کے متعلق جو بحث اُوپر گذر چکی ہے اس سے ظاہر ہے کہ سوال پردہ یا بے پردگی کا نہیں بلکہ پردہ یا زنا کا ہے۔ اور زنا قرآن کریم کے ممنوعات میں سے ہونے کے علاوہ اِنسانوں کو اخلاقی و جسمانی لعنتوں کا شکار بناتا ہے اور نسلِ انسانی کا قاطع ہے۔ آبادی کے بڑھنے کے جو اعداد و شمار اکھٹے کیے گئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بے پردہ نسلوں کی آبادی دن بدن کم ہو رہی ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ کو اقتصادی تغیّرات پیچیدہ بنا دیتے ہیں پھر بھی عام طور پر یہ امر قابلِ ثبوت ہے۔

جو اعداد و شمار میں ذیل میں بیان کر رہا ہوں، یہ کارساندرس کی کتاب "دی ورلڈ پاپولیشن" یعنی "آبادیٔ دنیا" (THE WORLD PAPULATION) (مطبوعہ آکسفورڈ) سے ماخوذ ہیں۔

نام ملک	موجودہ آبادی سنہ ۱۹۳۵ء	آئندہ آبادی	کس فاضل کا اندازہ ہے
برطانیہ	۴۰ ملین	سنہ ۲۰۳۵ء میں صرف ۱۹ ملین رہ جائیگی۔	چارلس
سکاٹ لینڈ	۴ ملین	سنہ ۲۰۳۵ء میں قریباً ایک ملین رہ جائیگی۔	چارلس
فرانس	۴۱ ملین	سنہ ۱۹۷۵ء میں صرف ۳۰ ملین رہ جائے گی۔	سووے
جرمنی	۶۵ ملین	سنہ ۲۰۰۰ء میں صرف ۴۶ ملین رہ جائے گی۔	کاہن اور برگ ڈورفر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی طرح دوسرے یورپی ممالک میں بھی جنسی آزادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آبادی کی ترقی میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی ممالک کی آبادی ترقی پر ہے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد میں ایک کروڑ کا اضافہ ہوا ہے۔ الجیریا میں مسلمان اس صدی کے شروع میں صرف تیس لاکھ تھے اب[1] ساٹھ لاکھ ہیں۔ یہی حال دیگر اسلامی ممالک کا ہے۔ ترکی اور ایران میں بے پردگی ابھی بہت نیا واقعہ ہے۔ بے پردگی کے یورپی اثرات کے واضح ہونے کے لیے ایک صدی یا کم از کم تین نسلوں کا گذرنا ضروری ہے۔ یہ سب ترقی باوجود اس امر کے ہے کہ مسلمان صنعتی ترقی میں بہت کم حصہ لے رہے ہیں۔ نیز اسلامی آبادی میں جو ترقی ہوئی ہے، وہ ایسے انسانوں پر مشتمل ہے جو پردہ کی پابندیوں کو قبول کرنے کی وجہ سے جنسی صحت و اخلاق کے لحاظ سے باقی تمام اقوام عالم سے بہتر ہیں اور یہی امر اسلامی آبادی کی آئندہ ترقی کا ضامن ہے۔ اگر مسلمان پردہ کے پابند رہے اور جنسی اخلاق میں سخت مضبوط رہے اور اس کے ساتھ صنعتی ترقی کی جانب متوجہ ہو گئے تو ممکن ہے کہ محض آبادی کی ترقی ہی ان کو دنیا کی قیصریوں کا وارث بنا دے۔

ایک اور غلط فہمی جو پردہ کے متعلق ظاہر کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ پردہ عورت کو مجلسی زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ اس جگہ غالباً یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پردہ عورت کو مرد سے ہوتا ہے نہ کہ عورتوں سے۔ دنیا کی نصف آبادی عورتوں کی ہے جس سے عورت کو پردہ نہیں ہوتا۔ عورت اس نصف دنیا سے مجلسی و معاشرتی تعلقات بلا کسی رکاوٹ کے رکھ سکتی ہے۔ عورت کو عورتوں سے تعلقات میں حسن اخلاق و سلیقہ کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی مردوں کو آپس کی ملاقات میں۔

[1] ۱۹۳۷ء

رفاقت محبت اور خدمت کی خواہشات بھی عورتوں کی نصف دنیا میں پوری ہو سکتی ہیں لیکن اگر کوئی عورت نصف دنیا سے ملنے کی آزادی کو غلامی تصور کرے اور اس کی زندگی کا مجلسی پروگرام خاوند کے دوستوں اور ملاقاتیوں کے ساتھ اختلاط کے بغیر پورا نہ ہو سکے اور اگر کوئی عورت عورتوں کی نصف دنیا میں دوستی اور محبت پیدا کر سکنے پر قانع نہ ہو اور اپنی نسوانیت کو چند مردوں کی ملاقات و خوشنودی حاصل کیے بغیر ضائع ہوتا ہوا خیال کرے تو اس عورت کے مقاصد کو محض مجلسی سمجھنا اس کو اور اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔

پردہ کے مخالف حضرات پردہ کو چند غیر فطری عیوب کا باعث گردانتے ہیں۔ ان حضرات سے غالباً یہ درخواست بیجا نہ ہوگی کہ محض قالینی منطق آرائی کی بجائے وہ یورپ کی معاشرت میں بھی ان عیوب کا مطالعہ کریں۔ پولیس کے کاغذات انہیں حیرت میں ڈال دیں گے اور مناسب علمی تفتیش کے بعد بے پردہ معاشرت کے متعلق ان کا غلط حسن ظن باقی نہ رہے گا۔[1]

بعض مخالفین کا خیال ہے کہ موجودہ پردہ اس لیے ناجائز ہے کیونکہ عرب میں اس قسم کے پردہ کا رواج نہ تھا۔ آج کل بھی ہمارے ان دیہات میں جہاں کی معاشرت اب تک قدیم عربی معاشرت کے مشابہ ہے۔ پردہ عربی پردہ کی طرح ہے لیکن شہروں میں آبادی، دولت منظم بداخلاقی اور معاشرتی منافقت کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ ان حالات میں پردہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جس صورت میں کہ اس وقت شہروں میں موجود ہے۔ یہ شہری پردہ عربی دیہاتی پردہ کی ہی ترقی یافتہ صورت ہے، جسے شہروں کے اخلاقی حالات کے مطابق کسی قدر بدل دیا گیا ہے اور یہ پردہ عربی اسلامی مدنی پردہ کی روایت ہے، جس میں

[1] ملاحظہ فرمائیں ضمیمہ نمبر ۱

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چنداں تغیر نہیں ہوا۔

تمام دُنیا کے مسلمان یورپی اقوام کی سیاسی کامیابی سے اتنے مرعوب ہو چکے ہیں کہ وہ یہ سمجھے بغیر کہ ان کے لیے یورپ کی مسلّمہ حقارت کی وجوہات علاوہ مذہبی اختلاف کے سیاسی و تاریخی ہیں جن کا علاج صرف دنیوی قوت کے عناصر کا حصول ہے، پردہ کو چھوڑنے اور یورپی تہذیب کے عناصرِ ظاہری کی تقلید سے یورپ کی نظروں میں یورپ سے برابری حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ہر تغیر ترقی نہیں ہوتا نہ ہر فرق نقص ہوتا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے کہ ہم اپنی کامیاب طرزِ معاشرت کو اس لیے بدل دیں کہ یہ یورپی حکمرانوں کی ناکام طرزِ معاشرت کے مشابہ نہیں ہے؟ یہ زیادہ مناسب ہے کہ ہم یورپ کی بے پردہ معاشرت کے افسوس ناک نتائج پر غور کریں اور اُن کی درست جنسی حالت کو مسلمان عورتوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ ان پر چھوڑ دیں کہ وہ مسئلہ کے کون سے پہلو کو پسند کرتی ہیں۔

کئی حضرات جنسی پابندیوں کے خلاف یہ دلیل دیا کرتے ہیں کہ مغربی ماہرینِ نفسیات کے مطابق جنسی تسکین میں رکاوٹ "نیوروسس" یعنی امراضِ اعصابی پیدا کرتی ہے[1]۔ اس امر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ شادی اسی وجہ سے جائز کی گئی ہے۔ بلکہ نصف الایمان ہے اور پردہ اور شادی کا باہم ہونا ناممکن نہیں بلکہ پردہ شادی کو استقلال دینے کے علاوہ دوسری معاشرتی، جسمانی و روحانی خوبیوں کو بھی ممکن بنا دیتا ہے۔ اس میں انکار نہیں ہو سکتا کہ پردہ شادی سے پہلے جنسی تسکین اور شادی کے بعد جنسی بدنظمی کے راستہ میں حائل ہے اور پردہ دار سوسائٹی میں ہر جگہ اور ہر موقع پر جنسی تسکین ناممکن ہے۔ بے پردہ سوسائٹی میں جنسی تعلقات کے مواقع زیادہ آسانی سے اور زیادہ حاصل ہوتے ہیں اور ایسی سوسائٹی ان مغربی

[1] دیکھئے ضمیمہ نمبر ۲ "ادب و فن کا ایک پہلو"

ماہرین نفسیات کے مطابق زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ جسمانی لعنتیں، معاشرتی الم اور اولاد کے متعلق قباحتیں جو اس قسم کی جنسی بدنظمی سے رونما پذیر ہوتی ہیں پردہ کے حق میں کافی دلیل ہیں۔ تمام یورپی ادب کے اکثر المیہ رومیک اور افسانے صرف ایک بے پردہ سوسائٹی میں واقع ہو سکتے ہیں۔ اگر ادب آئینۂ حیات ہے تو یورپ کی جنسی زندگی ایک ٹریجیڈی یعنی دردناک المیہ ہے، جس میں خوشگوار تبدیلی صرف پردہ کے قبول کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں جنسی تعلقات میں رکاوٹ پیدا ہونے سے جذباتی اضطراب انسان کے روحانی قوائے تخلیق کو مضبوط کرتا ہے اور حسنِ تمدّن میں ظاہر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ تمام ادبی و فنی و علمی کشمکش و ترقی کے پیچھے وہ جذباتی اضطراب ہے جو جنسی ضبط نے زندگی کے ان پہلوؤں کی طرف منعطف کر دیا ہے۔ مکمل جنسی تسکین کی صورت میں انسان کی تمدّنی قوتیں امکانی حالت میں رہتی ہیں۔ جنسی خواہشات کی قربانیاں تمدّن کی تعمیر کی بنیاد ہیں[1]۔ اگر کوئی تہذیب جنسی خواہشات کو پورا کرنے کی طرف مائل ہو جاتی ہے تو وہ تہذیب ان قوتوں کو آہستہ آہستہ ضائع کر دیتی ہے جو تمدّن کی بنیاد ہیں اور وہ تہذیب تنزّل کی جانب مائل ہو جاتی ہے۔ لیکن مکمل جنسی رکاوٹ اگر انسانی تہذیب کے لئے اعلیٰ ترین حالات پیدا کر سکتی ہو، ظاہر ہے کہ ناممکن العمل ہو گی اور قاطع نسلِ انسانی بھی ہو گی۔ اور انسانوں کے بغیر تمدّن کوئی معنی نہیں رکھتا۔

تاریخِ انسانی میں جہاں کہیں کوئی قوم ترقی کی راہ پر گامزن نظر آتی ہے، وہ قوم

[1] J. C. UNWIN : SEX AND CULTURE (۱۹۳۴ء) ۔ اُنون کے نزدیک معاشرتی بالیدگی، جذبۂ دریافت، وسعت کی طرف میلان اور سرگرمیٔ عمل اُس وقت ایک سوسائٹی میں نظر آتے ہیں جب کہ زنا کے خلاف قوانین پر سختی سے عمل ہوتا ہے۔ ایسی سوسائٹیاں جو قبل از نکاح اور بعد از نکاح جنسی عمل کی دلدادہ ہوتی ہیں کاہل اور غیر ترقی پذیر ہوتی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس وقت جنسی پابندیوں میں بھی مصروف نظر آتی ہے۔ سمیری، بابلی، یونانی اور رومی اقوام نے اپنی تاریخ کے آغاز میں ایک مرد اور ایک عورت کی مستقل شادی کے قوانین جاری کیے۔ تاریخ سے ظاہر ہے کہ جہاں کبھی شادی اور وفاداری کا خیال غالب ہوا ہے، عورت اور مرد کی برابری کے نظریئے کو صدمہ پہنچا ہے اور عورتوں کے عصمت پر فخر کرنے سے انہیں وہ معاشرتی پابندیاں قبول کرنی پڑی ہیں جو اُن کے عصمت پسند خاوندوں نے ان پر عائد کی ہیں۔ ان حالات میں قوموں کی ترقی شروع ہوتی ہے۔ لیکن بڑھتی ہوئی سلطنت اور امارت ہر قوم کے لیے پہلی جنسی پابندیاں ناقابلِ برداشت بنا دیتی ہے اور ان پابندیوں کو چھوڑنے کا دَور ہمیشہ قومی وقار کے انحطاط کے دَور کا ہمعصر ہوتا ہے اگرچہ علمی تفتیش سیاسی حالات و عناصرِ قوت کے حصول کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔

جنسی وفاداری اور تنظیم کی تعلیم جو آنحضرتؐ نے عربوں کو دی، ان فتوحات سے غیر متعلق نہ تھی جو آنحضرتؐ کے زمانہ میں اسلام کو ہوئیں۔ اسلامی نکاح اور جنسی پابندیوں میں جو نسلیں پیدا ہوئیں اور تربیت پاتی رہیں وہ اطرافِ عالم میں فاتحانہ پھیل گئیں۔ انہوں نے ایک عظیم الشان سلطنت اور دنیا کی متمدّن ترین تہذیب کو پیدا کیا۔ شجاعت و جرأت میں اسلامی عساکر اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ ایک ہزار سال تک مسلمان دُنیا کی تاریخ کے مالک رہے ہیں۔ باوجود محکومی و ادبار کے یورپ کے مصنفین آج کل بھی مسلمانوں کے بہادر ہونے اور موت سے خائف نہ ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ شہدا کے یقینی موت کے متبسّم مقابلہ کے پیچھے وہ جنسی پابندیاں ہوتی ہیں، جو نکاح کی تقدیس اور پردہ کی وجہ سے اسلامی معاشرت میں رائج ہیں۔

یہ بالکل ممکن ہے کہ اگر ایک قوم پردہ کو قائم رکھے اور عناصرِ قوت پر قابو رکھے تو وہ دائمی طور پر اپنی تہذیب و سیاست کے وقار کو قائم رکھ سکے گی۔ یہ درست ہے کہ

آج عناصرِ قوت پر ہمارا قابو نہیں ہے۔ لیکن موجودہ حالات کی درست تشریح کے بعد جب ہم اصلی عناصرِ قوت کے حصول کی جانب توجہ مبذول کریں گے تو مستقبل اتنا تاریک معلوم نہ ہوگا جتنا کہ آج نظر آ رہا ہے۔ بشرطیکہ درمیانی وقفہ میں ہم جنسی پابندیوں کو کمزور نہ کر دیں اور ان قوائے تہذیب و حیات کو زندہ رکھیں جو صرف منظّم جنسی رکاوٹ کی حالت میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اِن حالات میں نکاح کی تقدیس کو قائم رکھنا انتہائی ضروری ہے اور جیسا کہ اُوپر کے اعداد و شمار، دلائل و براہین سے واضح ہے۔ پردہ کی ترویج ایسی معاشرت پیدا کر دیتی ہے، جس میں جنسی وفاداری، نسلِ انسانی کی بقاء اور جنسی رکاوٹ سب خوبیاں حاصل ہو سکتی ہیں اور ہم افراط و تفریط کے نقائص سے مصئون رہتے ہیں۔

پردہ کی حمایت سے یہ مراد نہیں کہ ہم عورتوں کی فلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ پردہ میں عورتوں کی فلاح سہی لیکن ہمارے فرائض عورتوں کی جانب محض پردہ سے زیادہ وسیع ہیں۔ سب عورتوں کے لیے بہتر تعلیم اور تحفظِ صحت کے سامان اور ضرورت مند خواتین کے لیے پردہ کے ساتھ ساتھ کام کاج کے مواقع بہم پہنچانا قومی فرض سمجھنا چاہیئے۔

بعض حضرات نے دماغی عدم توازن کی وجہ سے پردے کو جہالت کا دوسرا نام سمجھ لیا ہے۔ پردہ چھوڑنا کوئی طلسم نہیں ہے جسے عمل میں لانے سے عورت فوراً عالم فاضل بن جاتی ہے۔ کئی غیر مسلم اقوام کی عورتیں ہزاروں سال سے بے پردہ اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ جہاں جہاں بھی اسلامی حکومت رہی ہے وہاں مسلمان عورتیں دوسری بے پردہ عورتوں سے زیادہ تعلیم یافتہ اور شائستہ رہی ہیں۔ آج کل ہماری عورتیں اِس لیے تعلیم یافتہ نہیں ہیں کیونکہ ہم نے پردے کے اندر اِن کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں کیا۔

یورپ اور روس میں بھی چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کے سکول علیحدہ بننا شروع ہو گئے ہیں کیونکہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ نہایت چھوٹی عمر میں لڑکے اور لڑکیاں جنسی تعلقات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیدا کر سکتے ہیں۔ میری سٹوپس "سیکس اینڈ دی ینگ" یعنی جنس وطفولیت) اور دیگر مصنفین کے مشاہدوں سے واضح ہے کہ چھ اور دس سال کے درمیان کی عمر میں بھی لڑکیاں جنسی تجربہ رکھتی ہیں اور جنسی امراضِ قبیحہ میں مبتلا پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ایڈمنڈ بکر اپنی کتاب "لاز آف سیکس" یعنی "قوانین جنسیت" میں بیان کرتی ہیں کہ "مہذب اور امیر گھرانوں کے سات آٹھ سال کے بچوں کے لیے بھی یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ وہ اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ ہمجولیوں کے سامنے جنسی تعلقات قائم کریں"۔ وہ آگے بیان کرتی ہیں کہ امریکہ کے شہر بالٹی مور سٹی میں صرف ایک سال کے اندر بارہ سال سے کم عمر کی ایک ہزار سے زیادہ لڑکیاں عدالتوں میں جنسی مظلومیت کے مقدمات کے متعلق پیش ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مخلوط سوسائٹی مجبور سوسائٹی ہے۔ بچوں کی تعلیم شروع سے ہی علیحدہ علیحدہ ہونی چاہیئے۔ روس اور یورپ کے ماہرینِ تعلیم اس امر کو قبول کر رہے ہیں۔ بچوں کی حفاظت چھوٹی عمر سے ہی کرنی چاہیئے تاکہ ہماری نسلیں ہمیشہ ہمیشہ تک روحانی و دماغی ہیجان سے مضطرب رہیں اور ہماری تہذیب و وقار کو قائم رکھیں۔ اور ہم ان قبائح سے محفوظ رہیں جن سے نسلی کمزوری، جسمانی بیماری، خاندانی غم اور معاشرتی ذلت و منافقت کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ پردہ کی تکالیف کو بے پردہ سوسائٹی کی المناک حالت کے مقابلہ میں رکھ کر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ اس غیر تسلی بخش دنیا میں کونسی تکلیف زیادہ قابلِ قبول ہے۔

ہمیں چاہیئے کہ لڑکیوں کے لیے علیحدہ مدرسوں اور طبی و صنعتی کالجوں کی توسیع میں پوری کوشش کریں اور پردہ کے اندر اعلےٰ اور پاکیزہ تعلیم کا بندوبست کریں۔ مشین کے استعمال سے مزدوروں کی بچت ہوتی ہے۔ اس لیے تمام صنعتی ممالک میں لاکھوں مزدور بے کار رہتے ہیں۔ لہٰذا مناسب ہے کہ عورتوں کو مردوں کے برابر مزدور سمجھ کر ہم بے کار اور غریب مزدوروں کی تعداد میں اضافہ نہ کریں بلکہ خاندانی

زندگی کے قیام کی کوشش کریں۔ جو قوم اپنی عورتوں کو اعلیٰ مائیں اور بیویاں بنانے کی بجائے آزادی اور برابری کے الفاظ سے دھوکا کھا کر انہیں دوسرے درجہ کی نوکر یا کلرک بنا دیتی ہے وہ قوم زیادہ دیر تک اپنی تہذیب و سیاست کے وقار اور اپنی آبادی کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ جرمنی اور جاپان کے سیاست دانوں نے انہی حالات سے آگاہ ہو کر عورتوں کے لیے کارخانوں اور دیگر قسم کے کاموں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ ہمارے لیے بھی مناسب یہی ہے کہ برابری و آزادی کے الفاظ کی سطحی جھلک سے خیرہ ہو کر اپنی قوم کو مصیبت اور گمراہی کی جانب نہ لے جائیں۔

شہروں میں پردہ دار عورتوں کے لیے گھریلو قسم کی صنعتوں مثلاً جراب سازی، بنیان سازی، صابون سازی وغیرہ کے کارخانے ہونے چاہئیں اور عورتوں کے لیے خانہ داری اور صنعتی تعلیم کے لیے پردہ دار مدرسے ہونے چاہئیں۔ عورتوں کی صحت کے لیے مناسب کھلے مکان اور پردہ دار باغ نہایت ضروری ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ میونسپل کمیٹیاں اپنی آبادی کی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے پردہ دار باغ نہ بنا سکیں یا موجودہ باغوں کو پردہ دار بنا کر ہفتہ میں چند دن عورتوں کے لیے مخصوص نہ کر سکیں۔ ہر محلہ میں جہاں مسجدیں دو یا دو سے زیادہ ہوں، ایک مسجد کو عورتوں کے لیے مخصوص کر دینا چاہیئے تاکہ محلے کی عورتیں جمع ہو سکیں، وہاں نماز بھی ادا کریں اور آپس میں جان پہچان و میل جول سے معاشرتی تعلقات بھی بڑھائیں۔

نیز ہمیں اپنے دیہات اور شہروں میں پردہ کو زیادہ مانوس بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ فرضی حقارت یا انگشت نمائی کے خیال سے پردہ دار عورتوں کے ہمراہ بازاروں میں نکلنے سے شرمانا نہیں چاہیئے تاکہ ہمیشہ گاڑی یکے کی ضرورت کی وجہ سے پردہ ایک گراں تکلف نہ بن جائے۔ پردہ دار جلسے جہاں عورتیں مل کر اظہارِ رائے کر سکیں ضرور منعقد ہونے چاہئیں تاکہ عورتوں کی رائے بھی ہمارے مشوروں میں شامل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوسکے۔ غرض اس طرح ناممکن نہیں کہ ہم اپنی موجودہ زندگی کی اخلاقی بلندی کو قائم رکھتے ہوئے عورتوں کو دوسری اقوام کی عورتوں سے کسی لحاظ سے پیچھے نہ پائیں اور ہماری عورتیں باقی دُنیا کی عورتوں کے سامنے بہترین شہریت اور اخلاقی بلندی کے نمونے مہیا کرسکیں۔

مقالہ چہارم

تعدّدِ ازدواج

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ چہارم

اِس مقالہ میں کثیر الازدواجی کے مضمون پر بحث کی گئی ہے۔ جس سے مراد ایک مرد کا کئی عورتوں سے جنسی تعلق رکھنا ہے۔ ایک عورت کے کئی مردوں سے جنسی تعلق رکھنے کے لیے ان مقالوں میں پولی اینڈری (POLYANDRY) کا انگریزی لفظ بطور اصطلاح استعمال کیا گیا ہے۔

اس مقالہ میں مضمون زیرِ بحث "کثیر الازدواجی" ہے، پولی اینڈری نہیں ہے کیونکہ اسلام میں پولی اینڈری حرام ہے اور کثیر الازدواجی کی اجازت ہے۔ اِس لیے اسلام پر مغربی مصنفین کے حملے کثیر الازدواجی کے جواز کی بناء پر ہوتے رہے ہیں۔

ہندوستانی تاریخ میں دروپدی کا واقعہ پولی اینڈری کی مشہور مثال ہے۔ گلگت اور تبت کے بودھوں اور مالابار کے نائر لوگوں میں یہ رسم اب بھی رائج ہے۔ ظاہر ہے کہ قدیم زمانہ سے چلی آئی ہے۔ دروپدی پانچ پانڈوؤں سے بیاہی نہ جاسکتی اگر یہ اس زمانہ کا عام رواج نہ ہوتا۔ ڈارلنگ "پنجاب پیزنٹ" یعنی "پنجابی کسان" میں بھی پنجاب کی ایک غیر مسلم قوم میں اس رسم کے مروج ہونے کا ذکر کرتا ہے۔

کثیر الازدواجی ہر مذہب میں جائز ہے۔ اس ضمن میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں پولی گامی (POLYGAMY) یعنی کثیر الازدواجی کے مضمون پر جو آرٹیکل ہے اُس کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطالعہ کرلینا چاہیئے۔ ہندوستان کی تاریخ راجہ دسرتھ کی بیویوں کے جھگڑوں سے ہم خوب واقف ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی میں ریاست وجیانگر (دکن) کے حاکم دیوراجہ ثانی کی بارہ ہزار بیویاں تھیں، جن میں سے تین ہزار کے قریب اس کے ساتھ مرنے کے بعد آگ میں زندہ جلائی گئیں[1]۔

ظاہر ہے کہ راجہ دسرتھ اور دیوراجہ کے درمیان کثیر الازدواجی کی ایک دراز اور مسلمہ روایت ہے اور یہ رسم ہندوؤں میں آج بھی رائج ہے۔ ۱۹۰۱ء کی ہندوستان کی مردم شماری میں ہر ایک ہزار ہندو آبادی میں آٹھ خاندانوں میں کثیر الازدواجی رائج تھی۔ مسلمانوں میں کثیر الازدواجی کی مثالیں اس سے بھی کم ملتی ہیں کیونکہ ہر مردم شماری میں ہندوؤں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی ہے اور مسلمانوں میں یہ تفاوت نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا کثیر الازدواجی مسلمانوں میں عملاً بہت کم ہے۔

اسلام میں کثیر الازدواجی کی محض اجازت ہے۔ کثیر الازدواجی کا حکم نہیں ہے۔ اگر آپ ایک مرد سے ایک ہی بیوی کے تعلق رکھنے کو اعلیٰ ترین ازدواجی زندگی خیال کرتے ہیں تو بھی آپ اچھے اور سچے مسلمان رہ سکتے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ تمام مسلمان چار بیویاں بیاہتے ہیں۔ اگر تمام مسلمان مرد چار چار بیویاں کریں تو دنیائے اسلام میں عورتوں کی تعداد مردوں سے قریباً چار گنا ہونی چاہیئے لیکن یہ نہیں ہے۔ تمام اسلامی ممالک کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ عام طور پر نصف آبادی مردوں اور نصف عورتوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا عملاً کثیر الازدواجی مسلمانوں میں شاذ امر ہے اور غیر معمولی حالات میں یہ اجازت مفید ہوتی ہے۔ البتہ غیر مسلموں میں مثلاً عیسائی ممالک میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے اور پردہ رائج نہیں ہے۔ لہٰذا باوجود اس کے کہ وہاں ایک سے زیادہ بیوی کرنے

[1] VINCENT SMITH :- THE OXFORD HISTORY OF INDIA

کی قانوناً ممانعت ہے۔ عملاً جیسا کہ پچھلے باب میں اعداد و شمار سے ظاہر کیا گیا ہے۔ "کثیر الازدواجی" و "پولی اینڈری" دونوں ہی رائج ہیں۔

مگر اسلام میں کثیر الازدواجی کی اجازت ضرور ہے جیسا کہ یہودیت اور عیسائیت میں بھی ہے۔ اور یہ رواج اسلام نے یہودیت اور عیسائیت سے ہی ورثہ میں لیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہودیت اور عیسائیت میں بیویوں کی تعداد مقرر نہیں کی گئی۔ اس لیے چار سے زیادہ بیویوں کو نکاح میں لانا یہودیت اور عیسائیت میں جائز ہے اسلام میں کثیر الازدواجی کی اجازت کو صرف چار بیویوں تک محدود کیا گیا ہے۔

عیسائی اور یہودی بائبل کے پرانے عہد نامے کو اپنی مقدس کتاب مانتے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ، یعقوبؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ کو اللہ کے مقدس نبی مانتے ہیں۔ یہ سب پیغمبر ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کی سائرہؑ اور ہاجرہؑ دو بیویاں تھیں۔ حضرت یعقوبؑ نے پہلے دو بیویوں سے اور اس کے بعد ان کی دو لونڈیوں سے شادی کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون یہودیوں کے لیے خدائی حکم کی حیثیت رکھتا ہے لیکن حضرت موسیٰؑ نے کہیں بھی کثیر الازدواجی کی مذمت نہیں کی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی آٹھ بیویوں کے نام بائبل میں درج ہیں۔ حضرت داؤدؑ اور سلیمان علیہم السلام نے سینکڑوں بیویوں سے شادی کی۔ حضرت سلیمانؑ سات سو بیویاں اور تین سو لونڈیاں رکھتے تھے۔ ان بیویوں میں سے پہلی بیوی کی اولاد کے سوا باقی بیویوں کے بچوں کو کتاب مقدس میں ناجائز قرار نہیں دیا گیا بلکہ حضرت سلیمانؑ کا خدا کی جانب سے نبی منتخب ہونا جو حالانکہ پہلی نہیں بلکہ بعد کی بیاہی ہوئی بیوی کے چھوٹے لڑکے تھے، اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ خدا کا حکم ان کے والد حضرت داؤد علیہ السلام کی کثیر الازدواجی کے حق میں تھا۔ اور خدا کے نزدیک پہلی شادی کے علاوہ دوسری شادیاں بھی ہر لحاظ سے حقیقی اور مذہبی نکاح کی حیثیت رکھتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہی مقدس پیغمبروں کی نسل میں سے ہیں اور انہی پیغمبروں سے نسلی و روحانی تعلق رکھتے ہیں اور انہی کی طرح خدا کے برگزیدہ پیغمبر ہیں۔

غرض یہودیوں میں کثیر الازدواجی رائج تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے مقتدر پیغمبر ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ عیسائی بیان کے مطابق حضرت عیسےٰؑ اپنی اخلاقی تعلیم اور صاف گوئی کی وجہ سے مصلوب ہوئے۔ اگر وہ کثیر الازدواجی کو ناجائز اور خدا کی لعنتوں میں سے خیال کرتے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ صاف گوئی سے کام نہ لیتے لیکن حضرت عیسیٰؑ نے ایک دفعہ بھی نئے عہد نامے میں اس عبرانی روایت کو منسوخ نہیں کیا۔ مقدس ڈومی نیکن عیسائی راہب کامپ نیلا ۱۶۰۲ء میں اپنی کتاب "کیوی ٹاس سولس" یعنی "شہر خورشید" میں جس کا لاطینی سے انگریزی ترجمہ ٹیوڈر پبلشنگ کمپنی نیویارک نے شائع کیا ہے، فرماتے ہیں:-

"مقدس رومی کلیمنٹ کی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے اپنے مال و دولت کی طرح اپنی بیویوں کو بھی بہم کر لیا تھا۔"

(ص ۲۹۴)

مگر عہد نامۂ جدید سے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا کوئی حکم اس حالتِ ازدواجی کے جواز میں بھی نہیں پایا جاتا۔

پیٹر بین، مارٹن لوتھر کی سوانح عمری کی دوسری جلد میں مارٹن لوتھر کا یہ فقرہ تحریر فرماتے ہیں:-

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر ایک شخص ایک سے زیادہ بیویاں بیاہنا چاہے تو میں اس کو منع نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کا یہ فعل انجیل مقدس کے احکام کے خلاف ہوگا۔"

مارٹن لوتھر عبرانی، یونانی اور لاطینی زبانوں کے فاضل تھے اور پروٹسٹنٹ عیسائیت کے بانی ہیں اور انہوں نے ایک جرمن امیر فلپ ہیس کو دوسری بیوی بیاہنے کی اجازت دی۔ اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون پولی گامی (POLYGAMY) میں صاف درج ہے کہ کثیر الازدواجی انجیل کے احکام کے خلاف نہیں ہے۔

مارٹن لوتھر کی رائے عیسائیت کی ایک دراز روایت سے منسلک ہے۔ عیسائی عمل اور عقیدہ کثیر الازدواجی کو ناجائز قرار نہیں دیتا۔ پوپ گری گوری اپنے ایک خط میں ۷۵۳ء میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اگر ایک بیوی ایسی بیمار ہو کہ وہ شادی کے تعلقات کے فرائض انجام نہ دے سکے تو اس کا خاوند ایک اور بیوی بیاہ سکتا ہے۔"

سینٹ آگسٹائن کثیر الازدواجی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر ایک ملک کا رواج اجازت دے تو کثیر الازدواجی کوئی جرم نہیں۔ پوپ کلیمنٹ ہفتم نے کئی عیسائیوں کو دوسری شادی کی اجازت دی۔ جان ملٹن مشہور شاعر عبرانی، یونانی و لاطینی کا فاضل تھا۔ اپنی کتاب "کرسچین ڈاکٹرین" یعنی "عقائدِ نصرانیت" میں لکھتا ہے کہ

"چوتھی صدی عیسوی میں کلیسا کے احکام کے مطابق کلیسا کے عمائد اور ڈیکنوں کے انتخاب کو ان عیسائیوں پر محدود کیا گیا جو صرف ایک بیوی رکھتے تھے۔"

یہی مصنف پھر آگے لکھتا ہے:-

"اس سے ظاہر ہے کہ کلیسا کے دوسرے ممبروں کو کثیر الازدواجی کی اجازت تھی، اور وہ اس اجازت پر بلا تکلف عمل کرتے تھے۔"

یہ یقینی امر ہے کہ عیسویت کی اولین صدیوں میں اور قرونِ وسطیٰ میں کثیر الازدواجی عیسائیوں میں عام رائج تھی۔ مشرقی رومی سلطنت کا قریباً ہر بادشاہ ایک سے زیادہ

محکم دلائل سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnet.com

بیویاں رکھتا تھا۔ ان بادشاہوں کی فہرست دراز ہے اور مشرقی رومی سلطنت، یعنی بائزانطین حکومت کی کسی تاریخ سے اس امر کا ثبوت مل سکتا ہے۔ شہنشاہ ویلنٹینانس اور کونسٹین ٹیس جو کونسٹینٹائن اعظم کا بیٹا تھا، کئی بیویاں رکھتے تھے۔ کلوویس شاہ فرانس، ہیری برٹوس وہائی پیرکس اس کا بیٹا سب کثیر الازدواج تھے۔ پیپن وشارلمین مشہور صلیبی مجاہد شاہ فرانس کو بھی اس فہرست میں شامل کر لینا چاہیئے۔ سینٹ اسپرگنس شاہ شارلمین کی کئی بیویوں کا ذکر کرتا ہے۔

ارنالفس ہفتم شہنشاہ جرمنی ۸۸۸ء۔ فریڈرک باربروسہ، فلپ تھیوواتس شہنشاہ فرانس، مشہور بادشاہ ہیں اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ فرینک بادشاہوں کی پہلی نسل میں اکثر بادشاہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ اور شاہ کوتران کی تین بیویاں مسلمہ تھیں۔ فادر دانیال فرانسیسی بادشاہوں کی کثیر الازدواجی کا ذکر کرتا ہے اور شاہ دیگوبست اوّل کی تین بیویاں تسلیم کرتا ہے۔ غرض اس قسم کی مثالیں عیسائی تاریخ سے بے شمار مہیا کی جا سکتی ہیں۔ یہ سب عیسائی عورتیں ان عیسائی بادشاہوں سے عیسائی قوانین کے مطابق شادی شدہ تھیں۔ عوام بھی علیٰ ہذا القیاس کثیر الازدواجی کو جائز خیال کرتے اور حسب ضرورت اس پر عمل پیرا تھے۔ ایک بیوی بیاہنے کا قانون عیسائیت سے پہلے سلطنت روما کا قانون تھا جو عیسائی یورپ نے ورثہ میں لیا۔ لیکن اگرچہ روایتی تعصب اور زندگی کی عام آسانی ایک بیوی کے اصول کے حق میں تھی۔ عیسائی مذہب میں کثیر الازدواجی کی اجازت مذہبی طور پر ہمیشہ رہی ہے اور عیسائی مذہبی اکابرین نے کبھی اس سے انکار نہیں کیا۔

عیسائی فرقہ اناباپٹسٹ کثیر الازدواجی کے حق میں تھا۔ انیسویں صدی میں امریکہ میں ایک عیسائی فرقہ ظہور میں آیا، جس کا نام مورمن ہے۔ انہوں نے اوّلین عیسائیت کی روایات کا احیاء کیا اور کثیر الازدواجی کو دوبارہ علی الاعلان رائج کیا۔ یہ

فرقہ بیسویں صدی کے شروع میں بھی کثیر الازدواجی پر عمل پیرا تھا۔ آخر کار ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے قانوناً اس کثیر الازدواجی کو ممنوع قرار دیا۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ کثیر الازدواجی کے مسئلہ میں یہودیت و نصرانیت اور اسلام میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ہے تو اتنا کہ پرانے مذاہب میں کثیر الازدواجی کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ اسلام نے چار بیویوں کی حد مقرر کی اور ایک بیوی رکھنے کو ازدواجی زندگی کی اعلیٰ ترین حالت ظاہر کیا۔ ایک سے زیادہ بیوی سے شادی نہ کرنے کی عیسائیوں پر کوئی مذہبی پابندی نہیں ہے، بلکہ یہ یورپ کا صرف ملکی قانون ہے اور اگر ہم ان اعداد و شمار پر غور کریں جو یورپ کی جنسی کیفیت کے متعلق پچھلے باب میں بیان کیے گئے ہیں تو ظاہر ہو جائے گا کہ صرف ایک بیوی سے تعلق رکھنے کا ملکی قانون بھی یورپ میں واقعیت کے لحاظ سے محض ایک مردہ قانون ہے اور جنسی بدنظمی کی حالت میں کثیر الازدواجی کے ساتھ پولی اینڈری بھی شامل ہو جاتی ہے۔

ہمارے خیالات یورپ کے متعلق وہی ہیں جو یورپی قیصریت کے پروپیگنڈے نے یورپ کی عظمت و شوکت ہمارے دلوں پر بٹھانے کے لیے ہمارے سامنے رکھے ہیں اور یورپ کی معاشرتی زندگی کو یورپ کے مذہبی مبلغین نے اس طرح پیش کیا ہے کہ ہمیں اس کو مکمل طور پر اختیار کرنے کی خواہش ہو اور ہم اس معیاری اور اعلیٰ نما زندگی کو قبول کرنے میں یورپی مذہب کو بھی قبول کر لیں۔ یورپ کی کامیابی اور ہماری سیاسی مجبوری بھی ہمارے ذہن کو نقل پر مائل کرتی ہے اور ہمیں اپنی معاشرتی زندگی کے متعلق بے اطمینانی پر مجبور کرتی ہے۔ یورپ کی موجودہ برتری کی وجوہات مقالہ اوّل میں بیان ہو چکی ہیں۔

عناصر قوت کا حصول ہی حصول قوت پر منتج ہو سکتا ہے۔ معاشرتی زندگی کو یورپ کی معاشرتی زندگی پر ڈھالنے سے وہ سیاسی و اقتصادی قوت حاصل نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو سکتی جس کے ہم متلاشی ہیں۔ کیونکہ اس قوت کے عناصر معاشرتی زندگی سے مختلف ہیں اور بالوضاحت مقالۂ اوّل میں بیان ہو چکے ہیں۔

مگر خود یورپ کے لوگ اپنی زندگی کی مشکلات سے واقف ہیں اور کئی عیسائی فلسفی کثیر الازدواجی کو عیسائیت میں جائز سمجھ کر اس کے حق میں کتابیں لکھتے رہتے ہیں۔ لندن کی "سوسائٹی فار پروموٹنگ کرسچئن نالج" ان کتابوں کے جواب لکھتی رہتی ہے۔ مگر وہ حضرات جو یورپی عیسائی زندگی کے اسقام و نقائص سے آگاہ ہیں کثیر الازدواجی کی اجازت میں ہی اپنی فلاح و اصلاح پہچانتے ہیں۔

۱۹۳۴ء میں جے، ای کلیئر میکفارلین نے ایک کتاب "دی کیس فار پولی گامی" لکھی ہے جو یورپ اور خاص کر انگلستان میں کثیر الازدواجی کے اختیار کرنے کے حق میں دلائل پیش کرتی ہے اور اس میں ایک سے زیادہ بیویوں کے نہ کر سکنے کے خلاف یورپ کے ملکی قانون کی پُرزور مذمت کی گئی ہے۔ یہ کتاب "دی سرتج پبلشنگ کمپنی" لندن نے شائع کی ہے۔ ایسے حضرات کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے جو اس مسئلہ پر صداقت کے متلاشی ہیں یا یورپ کی زندگی کے متعلق فرد و بشر نقشے دماغ میں رکھتے ہیں۔ بہرحال کیونکہ یورپ کے متعلق ایک یورپی مصنف کے بیانات قابلِ وقعت ہوتے ہیں۔ اِس کتاب کا مطالعہ مفید ضرور ثابت ہو سکتا ہے۔

"دی کیس فار پولی گامی" میں کلیئر میکفارلین بیان کرتے ہیں کہ "اِنگلستان میں سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق سترہ لاکھ چھتیس ہزار (۱۷,۳۶,۰۰۰) عورتیں تعداد میں مردوں سے زیادہ ہیں لیکن ایک سے زیادہ بیویوں کے خلاف قانون نے اتنی عورتوں کے لیے شادی اور اولاد کی خوشی خلافِ قانون بنا دی ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی ہی مردم شماری کے مطابق پنتالیس لاکھ ستاسی ہزار (۴۵,۸۷,۰۰۰) عورتیں اِنگلستان میں ایسی ہیں، جو پندرہ اور پنتالیس سال کی عمر کے درمیان ہیں اور غیر شادی شدہ ہیں۔ اِن میں سے

چھتیس لاکھ پچپن ہزار (۳۶,۵۵,۰۰۰) عورتیں ایسی ہیں، جن کا کوئی ذاتی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ جب غیر شادی شدہ عورتیں معاش کی تلاش میں مردوں کے مقابلہ میں اترتی ہیں تو لاکھوں مردوں کو اپنی اُجرت اتنی کم کرنی پڑتی ہے کہ وہ اہل و عیال کے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس طرح بے کار عورتوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن جب لاکھوں عورتوں کو مردوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے تو انہیں اس سنگ دل خود غرض دنیا سے محض ضروریاتِ حیات حاصل کرنے کے لیے اپنے جسم کو بھی بیچنا پڑتا ہے۔"

عورتوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مرد اپنی بیویوں کو طلاق دے کر ان سے شادی کر لیں۔ بے پردہ سوسائٹی میں مردوں سے ملاقات بڑھانے کے مواقع تو عام ہوتے ہیں۔ خاوندوں کے لیے عورتوں کی اس رقابت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بقول فاضل مصنف:-

"اکثر عورتوں کا چھٹا فیصد وقت ایک خاوند کو حاصل کرنے یا حاصل کر کے اس کو اپنے قابو میں رکھنے پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اس طرح عورتوں کے قوائے ذہنی بالکل برباد ہو جاتے ہیں اور اُن کے دل بُغض و حسد، وحشیانہ نفرت و شدید مخاصمتوں اور ذلیل سازشوں کی وجہ سے تنگ اور تاریک رہتے ہیں۔"

۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء کے دن کے اخبار "سنڈے ایکسپریس" میں درج ہے کہ عدالتوں میں ہر روز نوّے طلاق کے مقدمات پیش ہوتے ہیں۔ نیز ان سب غیر شادی شدہ عورتوں کو ناپسندیدہ حمل کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں جن کا نتیجہ خلافِ قانون اسقاط الحمل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں عورتوں کی تجارت زندگی کا ایک اور ناخوش کُن پہلو ہے جو اِن حالات کا لازمی نتیجہ ہے۔

فاضل مصنف میکفارلین افسوس کرتے ہیں کہ عورت پر یہ سب ظلم عیسائیت کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نام پر روا رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ کتاب مقدس کے عہد نامہ عتیق و جدید میں کثیر الازدواجی کی کہیں بھی ممانعت نہیں ہے۔ عیسائی کثیر الازدواج پیغمبروں کے الہامات کو خدائی احکام تصور کرتے ہوئے کثیر الازدواجی کے خلاف ہیں۔ پھر یہی مصنف فرماتے ہیں :-

"ہم صرف اپنی عورتوں کو فاحشہ بنانے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ جہاں جہاں ہم عیسےٰ مسیح کا پیغام لے جاتے ہیں ہم اس کے ساتھ اپنا معاشرتی نظام بھی لے جاتے ہیں اور غیر مسیحیوں کو آمادہ کرتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح اپنی عورتوں کو بازاروں میں دھکیل دیں تاکہ وہ بھی ہماری عورتوں کی طرح بے خانماں زنانِ بازاری بن جائیں۔" (ص ۶۵)

اور آگے بیان کرتے ہیں :-

"لیکن ہمارا کلیسا ایک رہنما محافظ کی بجائے ایک ڈکٹیٹر رہا ہے۔ ایک طرف یہ محبت کا پیغام دیتا ہے، جس سے شہید اور ولی پیدا ہوں دوسری طرف تلوار لے جاتا ہے۔ انسانی رُوح کو غلام بنانے کے لیے اس نے وحشیانہ جنگ کی ترغیب دی ہے اور ایسی لڑائیاں لڑی ہیں۔ مختلف العقیدہ لوگوں پر خونی مظالم کیے ہیں۔ اِرتداد کے بہانے انسانوں کو جلایا ہے اور انسانی غلامی دُور کرنے کی شدید مخالفت کی ہے۔" (ص ۶۶)

فاضل مصنف کلیسا کے اس رویّے کے خلاف غم و غصّہ کا اظہار کرتے ہیں۔ جو کلیسا نے کثیر الازدواجی کے متعلق یعنی اس کے خلاف اختیار کیا ہوا ہے اور وُہ اپیل کرتے ہیں کہ زندگی کے روزمرّہ مشاہدات کو نظر انداز کیا جائے۔ کیونکہ روزمرّہ کے بیّن واقعات اِس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ :-

"باوجود مذہبی مجبوری کے مردوں سے ایک بیوی کے قانون کی متابعت نہیں کرائی جا سکتی۔ ہمارے ملک اور ایسے ممالک میں جہاں کثیر الازدواجی کا رواج ہے فرق صرف یہی ہے کہ وہ ایمان داری اور صاف گوئی سے کام لیتے ہیں اور ہم منافقت پر مجبور ہیں۔"

غالباً اس کتاب سے زیادہ اقتباسات کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ جو فاضل مصنف یورپ کی تشنۂ جنسیّت عورتوں کے متعلق مشاہدہ کی بناء پر تحریر کرتے ہیں۔ اِس مختصر مقالہ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ مگر جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس سے اسلامی اصولوں کی برتری اور اعتدال پسندی واضح ہے۔

فطرت کے قوانین سے بھی کثیر الازدواجی کی اجازت کی ضرورت کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے ایسے دلائل کو اس لیے نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ سب مسلمان کثیر الازدواجی کے حق میں واضح فطرتی براہین سے واقف ہوتے ہیں۔ حمل کے ایّام میں، چلّہ میں اور بچّہ کو دُودھ دینے کی مدّت میں۔ ممنوعہ حالات میں عورت ازدواجی فرائض انجام نہیں دے سکتی اور مردوں کی ایک اقلیّت ایسی ہے جو اگر کثیر الازدواجی کی اجازت نہ ہو تو جنسی بدنظمیوں پر مجبور ہو جائے گی لہٰذا ایک قوم کی معاشرتی پاکیزگی صرف محدود کثیر الازدواجی سے ہی قائم رہ سکتی ہے۔ اگر دراز جنگ یا اس لیے کہ زندگی کی کٹھن ذمہ داریاں مرد پر عورت کی نسبت زیادہ ہیں یا اور اتفاقی وجوہات سے عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو جائے تو قوم کو اخلاقی اور نسلی بربادی سے روکنے کا واحد علاج صرف کثیر الازدواجی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے کئی مفکّرین بھی کثیر الازدواجی کے حق میں ہیں۔

پہلی بیوی کو صرف اِس لیے طلاق دے دینا کیونکہ مرد کو دوسری عورت سے نکاح کرنے کی خواہش یا ضرورت ہے، پہلی بیوی اور اُس کی اولاد سے سخت ناانصافی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیونکہ غالباً اس وقت تک پہلی بیوی گھر کے آرام اور بچّوں کی پیدائش کی وجہ سے آزادانہ روزی کمانے کے قابل نہیں رہتی۔ کسی دوسری عورت کے ساتھ جنسی تعلقات رکھنا اور اس کو بیاہ نہ سکنا۔ کیونکہ سوسائٹی دوسری عورت سے نکاح کی اجازت نہیں دیتی اُس کو اور اپنے آپ کو اور سوسائٹی کو اخلاقی ذلّت میں کھینچنا ہے اور اپنی اولاد کو جو دوسری عورت سے ہو ورثہ سے محروم کرنے کے علاوہ ذلّت اور خواری میں دھکیلنا ہے جو سراسر ظلم اور بے انصافی ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی کہ ایک عورت اور ایک مرد کا مستقل نکاح اعلیٰ ترین ازدواجی حالت ہے۔ کثیر الازدواجی کی اسلامی قسم کی محدود اجازت کا ہونا قومی و نسلی پاکیزگی کے لیے سخت ضروری ہے۔

اسلام فطرت اور اخلاقی پاکیزگی کو مدّنظر رکھتے ہوئے محدود کثیر الازدواجی کی اجازت دیتا ہے اور اس حالت میں بیویوں کے درمیان سخت انصاف اور مکمل انصاف کا حکم دیتا ہے جو کڑی شرط ہے اور جو دوسرے مذاہب میں نہیں ہے۔ یہ حالات ان حالات سے بہت بہتر ہیں جہاں ایک سے زیادہ بیوی نہ کر سکنے کی قانونی مجبوری صرف جنسی بدنظمی، بے سود طلاقیں بے ورثہ و ناجائز اولاد، معاشرتی ابتری اور منافقت پیدا کرتی ہے۔

مناسب ہوگا کہ اس مقالہ کو کینن آئزیک ٹیلر کے ان الفاظ پر ختم کیا جائے جو انہوں نے انگلستان کی چرچ کانگریس کو خطبہ دیتے ہوئے فرمائے تھے اور جو لندن ٹائمز سے ماخوذ ہیں:-

"مسلمان ممالک میں کثیر الازدواجی کے عمل میں نہایت سخت ضبط و نظم برتا جاتا ہے اور یہ کثیر الازدواجی اِس پولی اینڈری کے مقابلہ میں جو یورپی شہروں کی لعنت ہے اور جو اسلام میں بالکل نہیں پائی جاتی عورتوں کے لیے بہت کم باعثِ ذلّت اور مردوں کے لیے بہت کم باعثِ نقصان ہے۔"

مقالہ پنجم

خنزیر خوری

www.KitaboSunnat.com

مقالہ پنجم

جیسا کہ مقالہ دوم میں بیان ہو چکا ہے مسلمان تہذیب کے عناصرِ قوت کی غلط تشریح کے باعث اپنی تہذیب کے ان پہلوؤں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں جن میں اسلامی تہذیب یورپ کی تہذیب سے مختلف ہے۔ منجملہ ازیں خنزیر خوری کی ممانعت ہے۔ اسلامی دنیا کے مغرب زدہ حلقوں میں خنزیر خوری کا رواج عام ہو رہا ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لیے قاہرہ، استنبول و انقرہ کی زندگی اور مشرق قریب کے ان مسلمانوں کی زندگی کا مشاہدہ کافی ہوگا جو بوجوہ دراز یا قلیل عرصہ کے لیے یورپ میں مقیم ہیں۔ میں اپنے ذاتی مشاہدہ کے بعد ان افسوسناک حالات کا ذکر کر رہا ہوں۔

خنزیر خوری سب سے پہلے چین میں شروع ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ تمام دنیا میں رائج ہو گئی۔ قرآن کریم نے سؤر کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے مگر کھانے کے جواز میں کہا جاتا ہے کہ آج کل مہذب ترین اقوام سؤر کھاتی ہیں مسلمان محض بے بنیاد تعصب کی بناء پر ایک مفید خوراک کو کیوں اپنے اوپر حرام کر لیں وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا اس جگہ ان امراض کا بیان جن کا تعلق سؤر سے ہے غالباً غیر مفید نہ ہوگا۔

سؤر ایک غلیظ جانور ہے۔ لاطینی کا مشہور شاعر ہوریس اسے "گندگی کا دوست" کہتا ہے۔ موجودہ سائنس نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ تمام جانداروں میں مرض کا ایک دائرہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قائم ہے۔ جس طرح مکھی۔ مچھر۔ چوہے وغیرہ امراض کے حامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح سائنس نے سؤر کو بھی بہت سی امراض کا حامل ثابت کیا ہے۔

پیچش (DYSENTRY) کی وہ قسم جو (BELANTIDNIICOLI) جراثیم سے پیدا ہوتی ہے، ایک تکلیف دہ بیماری ہے جو مہلک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ جراثیم عام طور پر سؤر کی انتڑیوں میں پائے جاتے ہیں اور اس کی غلاظت کے ساتھ خارج ہو کر اپنے اوپر ایک خول بنا لیتے ہیں۔ لیکن اس خول کے اندر زندہ رہتے ہیں۔ ڈاکٹر چینڈلر[1] نے ثابت کیا ہے کہ اس حالت میں یہ جراثیم انسانی خوراک میں داخل ہو جاتے ہیں اور پیچش کا باعث بنتے ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ کا محکمہ پبلک ہیلتھ اس مسئلہ پر غور اور تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس جانور کو انسان سے علیحدہ رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ڈاکٹر چینڈلر نے ثابت کیا ہے یہ مرض زیادہ تر انہی ممالک میں پایا جاتا ہے جہاں سؤر کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔

۲:۔ ڈاکٹر چینڈلر نے اپنی کتاب میں ایک اور قسم کے جراثیم کا ذکر کیا ہے جنہیں (FACIOLOPSIS BUSKI) کہتے ہیں۔ یہ جراثیم سؤر کے ذریعے پانی میں اور پانی کی جونکوں میں چلے جاتے ہیں اور ایسا پانی پینے سے انسان کے معدے میں پہنچتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ دست لگ جاتے ہیں اور تمام جسم سوج جاتا ہے۔

۳:۔ مشہور بیماری (HOOKWORM DISEASE) کے جراثیم جسم میں کھال کے رستے سے داخل ہوتے ہیں اور معدے تک پہنچتے ہیں۔ مریض میں خون کی کمی اور بخار کی علامات ظاہر ہوتی ہیں اور معدہ کے زخموں کے ذریعے تپ محرقہ کے جراثیم اور پھیپھڑے میں تپ دق کے جراثیم داخل ہو کر اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔

---

[1] CHANDLERS ANIMAL PRASITES AND HUMAN DISEASE (1926) Page-7

یہ بیماری بھی سؤر کے ذریعے پھیلتی ہے۔ سؤر اُس انسان کا فضلہ کھا لیتا ہے جسے پہلے یہ بیماری ہو۔ یہ کیڑے سؤر کے اندر انڈے دیتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر جب سؤر کے فضلے میں خارج ہو جاتے ہیں تو انسان کے لیے متعدی ثابت ہوتے ہیں۔ امریکہ میں راک فیلر انسٹی ٹیوٹ فلموں کے ذریعے لوگوں کو ان کیڑوں کے حالات سے آگاہ کرتا رہتا ہے تاکہ لوگ سؤر کے متعلق خائف رہیں۔

۴:۔ ایک اور بیماری کے کیڑے ہیں جنہیں (ROUND WORMS) کہتے ہیں، یہ نو دس انچ لمبے ہوتے ہیں اور جسم کے مختلف حصص میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مریض کو نمونیہ اور خناق کی قسم کے امراض اور امعا کے امراض یکے بعد دیگرے لاحق ہوتے ہیں اور طبیب درست تشخیص نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر سٹٹ نے ظاہر کیا ہے کہ یہ کیڑے بھی سؤر کی وساطت سے ہی انسانی جسم میں پہنچتے ہیں۔

۵:۔ پھیپھڑوں سے خون بہنا یعنی (ENDEMIC HAEMOPTYSIS) مشرقی ایشیا میں بہت عام مرض ہے۔ اس مرض کے جراثیم بھی صرف سؤر کے ذریعے انسان تک پہنچتے ہیں۔ یہ مرض صرف انہی ملکوں میں پایا جاتا ہے جہاں کی معاشرت سؤر اور انسان میں قرب پیدا کرتی ہے۔ جن ملکوں میں سؤر نہیں پایا جاتا وہاں یہ مرض قطعی مفقود ہے۔ اس مرض کا ابھی تک خاطر خواہ علاج دستیاب نہیں ہو سکا۔

۶:۔ ایک اور مرض جو خنزیر پرور انسانوں کو خنزیر سے حاصل ہوتا ہے اُس کا ڈاکٹری نام (CLONORCHIASES) ہے۔ اس مرض میں جگر سوج جاتا ہے اور انسانی جگر کی تباہی کا باعث وہی جراثیم ہوتے ہیں جو سؤر کے جگر میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور اسی سے انسان کے جسم میں منتقل ہوتے ہیں۔ جہاں سؤر نہیں پایا جاتا وہاں یہ مرض قطعاً مفقود ہے۔

۷:۔ ڈاکٹر ووماسٹوریا اس ایک اور امعائی کرم (GIGANTOHYSCHUS GIGAS)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا ذکر کرتے ہیں جو بیس تیس سنٹی میٹر لمبا ہوتا ہے اور جنوبی روس میں انسان کے علاوہ صرف سؤر کی انتڑیوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے انڈے بھی سؤر کے فضلہ سے انسانی خوراک کے ذریعہ انسان کے اندر داخل ہوتے ہیں۔

۸:۔ تپ دق مشہور مرض ہے اور یہ مرض سؤر میں بہت پایا جاتا ہے۔ مریض سؤر کے گوشت کے ذریعے یہ مرض اپنے جسم میں داخل کرلیتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ پبلک ہیلتھ کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ حکومت ہر سال لاکھوں خنزیروں کو تباہ کر دیتی ہے کیونکہ انہیں تپدق ہوتی ہے اور ان کا گوشت کھانے سے انسانی حیات کو خطرہ ہوتا ہے۔

۹:۔ مشہور مرض (TAPEWORM) صرف خنزیر خور قوموں میں پایا جاتا ہے۔ اس مرض کے جراثیم کی تاریخ حیات یوں ہے کہ سؤر انسانی مریض کا فضلہ کھالیتا ہے اور اس کے امعاء میں اس مرض کے نامکمل کیڑے لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ کیڑے خون کے ذریعے سؤر کے جسم کے مختلف حصوں میں جاکر گھر بنا لیتے ہیں۔ لہٰذا سؤر کے کھانے والے حضرات سؤر کے ساتھ یہ کیڑے بھی اپنے جسم میں داخل کر لیتے ہیں۔ یہ کیڑا انسان کی انتڑیوں میں پہنچ کر مکمل ہوتا ہے اور کئی فٹ دراز ہو جاتا ہے۔ انسان کے فضلہ کے ساتھ اس کے انڈے خارج ہوتے رہتے ہیں لیکن اس کی نشوونما کے سلسلہ میں سؤر ایک لازمی کڑی ہے۔ اگر انسان سؤر نہ کھائے تو اسے یہ مرض ہو ہی نہیں سکتا۔

۱۰:۔ ایک اور مرض جسے (TRICHINIASIS) کہتے ہیں صرف خنزیر کے کھانے والوں کو لاحق ہوتا ہے۔ اس کے جراثیم خنزیر کے جسم میں سرایت کر جاتے ہیں اور اس طرح پھیلے ہوتے ہیں کہ خوردبین کا سطحی مشاہدہ ان جراثیم کی موجودگی کے متعلق مناسب معلومات بہم نہیں پہنچا سکتا۔ لہٰذا ڈاکٹروں کا پاس کیا ہوا گوشت بھی قابلِ اعتبار نہیں

ہوتا اور اکثر مرتبہ ان کیڑوں سے پیدا کیے ہوئے عوارض کا باعث ثابت ہوا ہے۔ اس مرض کے مفصل حالات ڈاکٹر رورنا[1] کی کتاب سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا امراض کے پورے حالات کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس غلیظ جانور کا گوشت کھانا یا انسانی معاشرت میں اس کو پالتو جانور کی حیثیت سے رکھنا انسانی حیات کے لیے کتنا خطرناک ہے۔ اس کے ذریعے پیدا کیے ہوئے مرض اکثر مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا معلومات کے حصول میں میرے ان احباب نے میری بہت امداد کی ہے جو طب مغربی کے ماہر ہیں۔ اگر کوئی اور اہلِ علم اس موضوع پر مزید تفتیش کریں تو وہ ایک پُراز معلومات کتاب لکھ سکتے ہیں۔

ہم مچھروں اور چوہوں کو امراض کا حامل خیال کرتے ہیں اور ان کو نیست و نابود کرنا اخلاقی فرض خیال کرتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا جذبۂ حفاظت سؤر کے گوشت کو حرام اور اس کے قرب کو مکروہ قرار نہ دے۔ لیکن افسوس ہے کہ کچھ مسلمان اپنی کم علمی کی وجہ سے اپنی تہذیب کے پاکیزہ اصولوں کو توہم و تعصب قرار دیتے ہیں اور فائدہ و نقصان سے قطع نظر محض تقلیدِ مغرب میں وہ خوشی محسوس کرتے ہیں جو غلاموں کو آقاؤں کی تقلید سے ہوتی ہے اور جو اسلام کی تشریح اور تجسّسانہ تہذیب کے شایانِ شان نہیں۔

یہ محض اتفاقی بات ہے کہ یورپ کی طاقت عرصہ تک دنیائے اسلام پر مسلّط رہی ہے۔ اگر ہم پر چین کی حکمرانی ہوتی تو ہم میں سے کچھ اصحاب چینیوں کی طرح چوہے کھانے کے شائق بن جاتے۔

حقیقت یہی ہے کہ جو چیزیں اسلام کے نزدیک حرام یا مکروہ ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانی علم اور عقل اور فطرت کے مطابق ناقابلِ خورونوش رہیں گی۔ ویسے دنیا کی

---

[1] MILTAN I. RORENAN : PREVENTIVE MEDICINE : Page. 755

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قومیں عجیب عجیب چیزیں کھالیتی ہیں۔ فرانسیسی مینڈک اور کئی قسم کے کیڑوں کو لذیذ خوراک سمجھتے ہیں۔ پرتگیزی مؤرخ نونیز[1] کے مطابق وجیانگر کی ہندو آبادی اور وجیانگر کے راجہ دوسرے جانوروں کے علاوہ چوہے، بلّی اور چھپکلی کے گوشت کو بھی بطور خوراک استعمال کرتے تھے اور یہ چیزیں وجیانگر کے بازاروں میں کھانے کے لیے زندہ بکتی تھیں۔ عارضی سیاسی حالات کے تحت اپنی پاکیزہ زندگی کے دائمی اصولوں کو چھوڑ دینا صائب عقل کی دلیل نہیں۔ اگر مسلمان ہر اتفاقی فاتح کی نقل کرتے رہیں گے تو معلوم نہیں آخر زمانہ تک کن کن ناپاک اور مکروہ چیزوں کو اپنی خوراک میں داخل کرلیں گے۔

انسانی تجربہ نے اسلام کے ورود سے صدیوں پہلے ہی سؤر کے گوشت کو حرام کردیا تھا۔ مصر[2] قدیم میں سؤر کا گوشت عوام کے لیے ممنوع اور مقدس پجاریوں کے لیے قطعاً حرام تھا۔ یہی امر یورپ کے اوّلین مؤرخ ہیرودوٹس[3] کی یونانی تاریخ میں بھی درج ہے۔ قدیم لاطینی مؤرخ پلنی[4] کے مطابق قدیم عربوں، فنیشیوں اور حبشیوں میں بھی سؤر کے گوشت کا کھانا ممنوع تھا۔ تورات میں بیان ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ اور ہارون کو حکم دیا کہ "سؤر اگرچہ اس کے سُم پھٹے ہوئے ہیں تمہارے لیے ناپاک جانور ہے۔ تم اس کا گوشت نہ کھاؤ نہ اس کی لاش کو چھوؤ۔ وہ تمہارے لیے ناپاک ہیں"۔ یہی حکم عہد نامہ قدیم میں اور بھی کئی[5] جگہ آیا ہے۔ سؤر کا گوشت مذہبی لحاظ سے بھی یہودیوں اور عیسائیوں پر ایسا ہی حرام ہے جیسا کہ مسلمانوں پر۔ حضرت عیسیٰؑ یہودی النسل تھے اور وہ بھی اس کو یہودی

---

[1] NINCENT SMITH : THE OXFORD HISTORY OF INDIA : Page.315

[2] SIR G. WILKINSON : ANCIONT TGYPT

[3] HERODOTUS

[4] PILNY

[5] DENTRONOMY

قانون کے مطابق حرام خیال کرتے تھے۔ انجیل سے ان کا سؤر کا گوشت کھانا ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ حضرت عیسیٰؑ نہایت بے خوف اور صاف گو انسان تھے اگر وہ یہ جانتے ہوئے کہ یہودی سؤر کو حرام خیال کرتے ہیں، اس جائز اور حلال بنانا چاہتے تو صریح الفاظ میں حکم فرماتے۔ مگر ایسا کوئی حکم عہد نامہ جدید میں موجود نہیں۔ البتہ عہد نامہ جدید میں کہانی کی صورت میں سؤر کی ناپاکیزگی کو بیان کیا گیا ہے۔

متی کے آٹھویں باب میں درج ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے شیطانی رُوحوں نے اجازت چاہی کہ وہ سؤروں میں چلی جائیں اور حضرت عیسیٰؑ کے حکم سے وہ خبیث رُوحیں سؤروں میں داخل ہوگئیں۔ وہ سؤر دیوانہ وار بھاگے اور پانی میں ڈوب گئے۔ مرقس کے پانچویں باب میں بھی اسی قسم کا قصہ درج ہے۔ غرض خدائی حکم اور مُوسوی قانون کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات میں سؤر اور شیطانی رُوحوں کا تعلق اُسی کراہت کا ثبوت ہے جو عبرانی تہذیب کو غالباً تجربہ و مشاہدہ کی بناء پر سؤر سے ہے۔ یہی نفرت حضرت عیسیٰؑ کے حکم "موتیوں کو سؤروں کے سامنے نہ پھینکو" اور حضرت سلیمانؑ کے "فاحشہ عورت کو سؤر کی تھوتھنی میں سنہری زیور" سے تشبیہ دینے سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

غرض مناسب ہے کہ مسلمان درست عناصر قوت یعنی علوم فطرت، صنعت اور اُس کے بنیادی درسی و اقتصادی نظام کے قیام کی جانب متوجہ ہوں اور مغربی قباحتوں کی تقلید میں دنیوی طاقت و وقار کے حصول کی بے سُود امید نہ رکھیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ ششم

صنم پرستی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ ششم

موجودہ زمانے کا محمود غزنوی نہ بُت شکن ہوتا نہ بُت فروش ۔ وہ ہم سب مسلمانوں کی طرح بُت نواز ہوتا ۔ سومناتھ پہنچ کر وہ سومناتھ کی پوجا میں انسان اور انسانیت کی تذلیل محسوس نہ کرتا ۔ وہ محض خزانۂ خسروی سے ایک قدیم فن کے نمونہ کی حیثیت سے سومناتھ کی حفاظت کے لیے وظیفہ مقرر کر دیتا ۔ کم از کم موجودہ مسلمانوں کا رویّہ بہت حد تک یہی ہے ۔

تحت الشعوری طور پر ہم نے حکمرانوں کی بُت پرستی کی روایات کو بُت نوازی کی منزل تک قبول کر لیا ہے اور یہ امر اسی تحریک کا حصّہ ہے جس کے اثر کے تحت غلط تشریح کی وجہ سے ہم حکمرانوں کے برابر ہونے کی خواہش میں اُن کے عناصرِ تہذیب کو اپنا رہے ہیں ۔ انقرہ میں اتاترک کمال کا بُت ، بغداد میں شاہ فیصل کا بُت ، قاہرہ میں زغلول پاشا اور آزادی کے بُت ، طہران میں فردوسی اور رضا شاہ کے بُت اسی تحریک کے کرشمے ہیں ۔ وطن پرست ان بُتوں کے پاس جاتے ہیں اور ان کے دِلوں میں اُن بُتوں کی عزّت کے وہی جذبات موجزن ہوتے ہیں جو کبھی کفّار کی دُنیا میں اُن بادشاہوں کے بُتوں کو دیکھنے سے پیدا ہوتے تھے ، جن کو بعد کی تاریخ نے قومی خدا بنا دیا ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک بُت دیوتا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ایک بُت جذبات کا مرکز بن جائے اور ہمارا جذبہ اس بُت کو سلام کرنے، اس پر پھول چڑھانے، اس کو پوشیدہ طاقت کے مخصوص مظہر سمجھنے پر آمادہ کر سکے اور قومی یا ذاتی مصیبت کے وقت اگر ہماری امیدیں پُراسرار مستقبل سے خواہشات کے حصول کے لیے اس بُت کا وسیلہ ڈھونڈیں تو اس بُت کو محض دیوتا نہ کہنا فقط لفظی اختلاف رائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا کے اس قسم کے مظہر ہمیشہ پرستش کی رسومات کے مرکز بن جاتے ہیں۔ جذباتی منطق اکثر عقلی دلائل پر غالب آجاتی ہے۔ ہم ایک قدم سے دوسرے قدم تک اپنا راستہ غلط نہیں دیکھتے لیکن کئی مرتبہ اس قسم کے سفر ہمیں ایسی منزل پر پہنچا دیتے ہیں جن کے تصوّر سے ہم اوّلین قدم پر سخت حیران اور خوفزدہ ہو جاتے۔

غالباً اسلام کے علاوہ اس وقت دُنیا کے تمام مذاہب بُت پرست ہیں۔ جو مذاہب اسلام کے مقابلہ کے لیے اپنے آپ کو توحید پرست بتاتے ہیں اُن کے اندر عملی بُت پرستی کی روایات موجود ہیں۔ اسلامی روایات بُتوں سے مکمل اجتناب کی روایات ہیں۔ لیکن آخری نسل میں غیر اسلامی حکمرانی کے ماتحت ہم بُت نوازی کی منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ انسان یا جاندار کی صورت بنانا ایک نسل پہلے حرام سمجھا جاتا تھا۔ آج قیصل و کمال و فردوسی کے بُتوں کو مسلمان اقوام سلام کرتی ہیں۔ اسلامی اداروں میں مہربان غیر مسلموں کی تصویریں آویزاں ہیں۔ ہمارے گھروں میں دوسروں کے خُداؤں کے بُت احترام کی نیّت سے اور فن کے نمونوں کی حیثیت سے عزّت و وقار کی جگہوں پر آراستہ ہیں۔ خود آگاہی انسانی عقل کا اعلیٰ ترین منصب ہے۔ کیا ہرج ہے اگر ہم اس امر کا احساس رکھیں کہ ہم بُتوں کے متعلق اپنی روایات اور اپنے عقائد میں ترمیم کر رہے ہیں۔ ہماری معاشرت میں بُت نوازی جو پہلے شاذ تھی اور اب مقبولِ عام ہے نیز یہ کہ بُت نوازی کا دَور اسلامی دُنیا پر بُت پرست و صنم ساز دُنیا کی

حکومت و غلبہ کے بعد رونما پذیر ہُوا۔ ہم بُت نوازی کے لیے اکثر فنون، حُسن و محبّت کی آڑ لے لیتے ہیں۔ لیکن فنون و حُسن اسلامی دُنیا میں پہلے بھی موجود تھے۔ مساجد، قلعے اور مقبرے بغیر بُتوں کے بھی خوب صورت ہیں۔ ہم نے موجودہ نسل میں حُسن و فن کے متعلق تمام مغربی اصولوں کو ترقی سمجھ کر قبول کر لیا ہے اور خود آگاہی کا یہ پہلو غالباً مکمل نہ ہو سکے گا۔ اگر ہم اس بات کو نظر انداز کر دیں کہ بُتوں کی پرستش ایک ادنےٰ قسم کی ذہنیت کا اظہار ہے اور یہ کہ نہ صرف جانوروں، بندروں، سانپوں، گائیوں وغیرہ کے بُتوں بلکہ اعلیٰ ترین انسان کے بُت کی پرستش بھی انسانیت کی تذلیل ہے۔ کیونکہ اللہ کے سوا کوئی عبادت یا جذباتِ عبادت کے لائق نہیں اور زندہ انسان ہر لحاظ سے انسان کے بُت سے افضل ہے۔

اوّلین زمانہ میں پتھر۔ درخت اور اس قسم کی دوسری اشیاء کی پرستش ہوتی تھی۔ روڈولف[1] آٹو نے اپنی کتاب جو اس نے آریہ دیوتاؤں کے متعلق لکھی ہے، بیان کیا ہے کہ سالگرام، پتھر اور تلسی پودے کو وشنو سمجھ کر پُوجا جاتا ہے۔ تھیپیا (یونان) میں خدا ایروس اور رہوڈس میں لنڈوس کے مقام پر اتھنیا دیوی کے بُت محض قدیم سرِراہ پتھر تھے جس وقت بعد میں سنگ تراشوں نے یُونانی صنم سازی کے بہترین نمونے پیدا کیے جب بھی یہ قدیم پتھر روایتاً پُوجتے تھے۔ نوعِ انسانی کے عالموں کا خیال ہے کہ غالباً ان پتھروں میں انسانی صورت یا جسم سے کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ جب انسانی ہاتھ نے تغیّر کر کے مذکورہ مشابہت کو اور واضح کر دیا تو بُت پرستی ظہور میں آگئی۔ عوام ان بُتوں پر پھول چڑھاتے تھے۔ ان کی خدمت میں قربانی اور نذرانہ پیش کرتے تھے۔ ان کے سامنے خوشبوئیں جلتی تھیں۔ ان کے رہنے کے لیے مکانات تعمیر کیے جاتے تھے جنہیں

[1] RUDOLF ATTO : GOTTHEIT AND GOTTHEITTEN DER ARIER

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی موجودگی نے مقدّس مندر بنا دیا تھا۔ جن لوگوں میں بُت پرستی کا رواج ہے اُن کے یہاں اب بھی بُتوں کے متعلق یہ ردّیہ ہے۔ بُتوں کے سامنے دعائیں پڑھی جاتی تھیں۔ قربانیاں ہوتی تھیں۔ بہت سے مُعجزے ان بُتوں کے متعلق بیان ہوتے تھے۔ غرض تاریخ میں انسانی تصوّر نے ان بُتوں کو انسان سے بالاتر زندہ طاقتوں کا درجہ دے دیا تھا۔ یہ پتھر کے خدا آنے والے واقعات کا علم رکھتے تھے۔ غم اور خوشی پر قادر تھے۔ الہام اور خواب کے ذریعے اپنی خواہشات ظاہر کر سکتے تھے۔ ہندوستان کے کئی بُت جیسا کہ محمود غزنوی کی تاریخوں سے ظاہر ہے ہاتھ ہلاتے تھے اور آوازیں دیتے تھے۔ مصر میں خدا امّن رے کا بُت حرکتوں کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ دیوی ہیرا جب سائرلس کے باشندوں سے ناراض ہوگئی تو اس کے بُت نے شہر کے مندر میں غصّے میں پیٹھ موڑ لی اور مندر کی زمین سے خون کا فوّارہ اُبل پڑا۔ اسی طرح کے قصّے کہانیاں ہندی دیوتاؤں کے بُتوں کے متعلق بھی مشہور ہیں۔ تصوّر میں بُت اور شخصیّت کا تعلق انسانوں کے بُتوں کے متعلق روایتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اوکیٹیلیس سیزر اور مارک اینٹی کی لڑائی میں مارک اینٹی مارا گیا اور رومی دُنیا اوکیٹیوس کے قبضہ میں آگئی۔ اس لڑائی کے دنوں میں بارک اینٹی کا بُت جو الیا میں نصب تھا پسینہ سے شرابور رہتا تھا اگرچہ یہ پسینہ کئی مرتبہ پُونچھا گیا۔ صقلیہ کے بادشاہ ہیرو کا بُت اُس کی موت کے دن گر پڑا۔ ایتھنز میں طبیب طوقسارس کا بُت مریضوں کو لمسِ شفاء سے صحت یاب کرتا تھا۔ یہی مُعجزہ تھیسوس کے بہادر تھیاگنیز کے متعلق بھی بیان کیا جاتا تھا۔ اس قسم کی کہانیاں گذشتہ اکابرین کے بُتوں کے قیام اور اُن کو خدا بنا کر پُوجنے کا پیش خیمہ ہوتی تھیں۔ غالباً اس قسم کے عمل میں نفسیاتی کیفیت ہمیں جادُو کے اس کرشمے سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کئی مرتبہ دشمن کا بُت بنا کر دشمن کی موت یا تکلیف کے مقصد سے اس کو پگھلایا جاتا تھا یا اس میں سوئیاں چبھوئی جاتی تھیں۔ جس طرح

بُت کے ذریعے آنکھوں سے اوجھل دشمن ہماری ایذا رسانی محسوس کرتا تھا اسی طرح آنکھوں سے اوجھل خدا بھی اپنے بُتوں کی پرستش اور خدمت سے متاثر ہوتے تھے۔

یہ بھُول نہیں جانا چاہیئے کہ مغربی کفر کی دُنیا میں بھی صداقت اور ضمیر موجود تھا۔ یونانی ہیرکلائٹس پانچ سو سال قبل مسیح لکھتا ہے کہ "مورتوں کا پُوجنا ایسا ہی ہے جیسے کہ دیواروں سے گفتگو کی جائے"۔ یونانی فلسفی اور شاعر زینوفانیز اپنی نظم میں بیان کرتا ہے کہ انسان خدا کو اپنی صورت میں تصوّر کرتا ہے۔ اگر شیر اور بیل اور گھوڑے خداؤں کی مورتیں بناتے تو وہ شیروں۔ بیلوں اور گھوڑوں کی صورت میں ہوتیں۔ خدا واحد ہے۔ ہر جگہ موجود ہے اور زندہ طاقت ہے"۔ حکیم سقراط کا شاگرد اینٹستھی نیز کہتا ہے کہ "اگرچہ لوگوں نے کئی خدا بنائے ہیں۔ خدا صرف ایک ہے اور کوئی انسان بُتوں سے خدا کو نہیں پہچان سکتا"۔ مشہور فلسفی دیوجانس کلبی بُتوں کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کرتا تھا۔ زینوبیراگی کی کتاب متعلقہ "حکومت" کا جو حصّہ باقی ہے۔ اُس میں وُہ لکھتا ہے کہ اس کے تصوّر کی معیاری ریاست میں بُتوں کے مندر بنانے کی اجازت نہ ہوگی۔ پلوٹارک یونانی مصنّف نے نوما کی سوانح عمری میں افلاطونی فلسفی پوسی ڈونیوس کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ رومی اپنی تاریخ کے پہلے ایک سو ستّر سالوں میں خداؤں کے بُت نہیں بناتے تھے۔ وہ اس کو مذہب کے خلاف خیال کرتے تھے کہ ادنےٰ مخلوق اعلیٰ ہستیوں کی تصویریں بنائے کیونکہ خیال کے سوا کسی اور ذریعے سے عرفانِ الوہیّت ناممکن ہے۔ لاطینی مصنّف وارّو اِس بیان کا حوالہ دے کر لکھتا ہے" اگر یہ دستور جاری رہتا تو خداؤں کی پرستش پاکیزہ تر رہتی"۔ آگے بیان کرتا ہے" وہ جنہوں نے سب سے پہلے خداؤں کی نمودار مورتیں لوگوں کی پرستش کے لیے قائم کیں انہوں نے لوگوں کے دِلوں سے خداؤں کا مفید خوف دُور کر دیا اور بدعت شروع کی"۔ مشہور لاطینی مصنّف کیکرو "ٹسکولانس" میں بیان کرتا ہے کہ خدا لامکان ہے۔ اس کی کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صورت نہیں۔ وہ انسانی خیال یا انسانی رُوح کی طرح ہے۔ ہوریس مشہور لاطینی شاعر اپنی "ہجویات" میں ایک انجیر کے درخت کا ماجرا بیان کرتا ہے "کبھی میں انجیر کا درخت تھا۔ محض بے سود لکڑی۔ تب بڑھئی نے کچھ تامّل کے بعد کہ مجھے کرسی یا پرائپوس خدا بنائے آخر مجھے خدا بنانے کے حق فیصلہ کرلیا"۔ طنز آشکار ہے۔ لاطینی شاعر تو فیلیوس پیتل کے بُتوں کو بچّوں کے خواب و خیال سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بُتوں کی پرستش اس سے زیادہ عقلی حیثیت نہیں رکھتی۔

غرض یونانی اور رومی تہذیب بھی شروع میں بُت پرست نہ تھی اور قدیم اہلِ دانش بُت پرستی کو گمراہی خیال کرتے تھے۔ لیکن جب بُت بن گئے تو عوام جو دانش کے اعلےٰ مدارج پر نہیں پہنچ سکتے۔ نسلاً بعد نسلاً صریح بُت پرستی میں مشغول ہو گئے۔

مینوقیوس فیلکس لاطینی نے اپنی کتاب "اوکٹیویوس" میں بُت پرستی کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ باپ اپنے بچّے کی موت پر اس کی مورت بنا کر اپنی مہجور محبّت کو اس بُت کی پرستش سے تسکین دیا کرتے تھے۔ اس طرح نقل کو اصل اور غیر حاضر کو حاضر بنا لیا جاتا ہے۔ یونانی اور رُومی دُنیا میں اس قسم کی خانگی رسومات کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ (مشہور لاطینی مقرر کیکرو نے اپنی بیٹی کی موت پر اس کا بُت ایک مندر تعمیر کر کے اس میں رکھا جہاں اس بُت کی پرستش کی رسومات ادا ہوتی تھیں) اسی مصنّف نے دوسری وجہ یہ بیان کی ہے کہ یونانی بادشاہ اپنی سلطنتوں کے مختلف حصّوں میں اپنے بُتوں کی پرستش کرواتے تھے۔ تاکہ ان کی غیر حاضری میں بھی ان کی رعایا وفادار رہے۔ اس قسم کی پرستش بعد میں رُومی قیصریت میں بھی رواج پاگئی فرق یہ تھا کہ رومی قیصر روم کو اس کی موت کے بعد خدا تصوّر کرتے تھے۔ فرعون اور اس کے بُتوں کی پوجا مصر میں عام تھی۔ ہندوستان میں کئی راجاؤں کی آج تک خداؤں کے اوتار سمجھ کر پوجا جاتا ہے۔

اسلام کے تغیّرات پر غور کرنے والوں کے لیے یہ بے جا نہ ہوگا۔ اگر وہ اس بات کو بھی نظر انداز نہ کریں کہ بُدھ مذہب، یہودیت اور عیسائیت میں بھی شروع میں بُتوں سے اجتناب تھا۔ لیکن آخر کار بُت پرستی کی روایات آہستہ آہستہ ان مذاہب پر غالب آگئیں۔

اے۔ فوچر[1] اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ بُدھ مذہب کی اولیں صدیوں میں مہاتما بُدھ کی تصویر نہیں پائی جاتی۔ مہاتما بُدھ کی بجائے خالی تخت یا دو پاؤں کے نشان ہوتے ہیں۔ لیکن بُدھ کی وفات کے پانچ سو سال بعد سے مہاتما بُدھ یا فاقہ کش بُدھ کی نشستہ مورت بُدھ سنگ تراشی کی روایت میں داخل ہو جاتی ہے اور بُدھ مذہب ایک بُت پرست مذہب بن جاتا ہے۔

یہودیوں کے عہد نامۂ قدیم کے پینتیسویں[35] گیت میں بُتوں کو "انسانی دستکاری" کہا گیا ہے۔ اسی عہد نامہ کی کتاب دانش" میں لکھا ہے کہ "انسان کو شرم نہیں آتی کہ وہ ان سے بولتا ہے جو بول نہیں سکتے۔ جو خود بے طاقت ہیں ان سے طاقت و صحت کی دُعا کرتا ہے۔ زندگی ان سے مانگتا ہے جو خود بے جان ہیں۔ امداد ان سے طلب کرتا ہے جو کوئی تجربہ نہیں رکھتے۔ سفر میں ان کی حفاظت ڈھونڈتا ہے جو ایک قدم نہیں چل سکتے اور وہ جن کے ہاتھ نکمّے ہیں ان سے اپنی قوّتِ بازو کی کامیابی اور فائدہ کی امید رکھتا ہے۔

وہ دس احکام جو حضرت موسےٰؑ کو منسوب کیے جاتے ہیں اور جن کو یہودی اور عیسائی دُنیا خدا کا قانون سمجھتی ہے ان کا دوسرا حکم خداوند تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:۔

"تم ہرگز کسی ایسی ہستی کی جو آسمان یا زمین یا پانی میں ہے مورت نہ بناؤ"۔

---

[1] A. FORCHER : THE BEGINNINGS OF BUDDHIST ART

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس فرمان کی یہودیوں کے ربّی ہمیشہ یہ تفسیر کرتے رہے ہیں کہ کسی جاندار کی تصویر بنانا خداوندِ لاشریک کی رضا کے خلاف ہے خواہ وہ پرستش کے لیے نہ بھی ہو اور یہ فرمان اس بُت پرستی یا اس بُت سازی اور بُت نوازی کی بنیادوں پر جو بعد میں گاہے بُت پرستی میں تبدیل ہو جاتی ہے ضربِ کاری ہے۔ اسلام میں بھی یہ روایت صدیوں زندہ رہی۔ یہودیوں میں ایسی مُہروں کا استعمال ممنوع تھا جن میں انسانی تصویر ہو لیکن یہودی تہذیب بُت پرستی سے محصور تھی اور آہستہ آہستہ یہودی زندگی میں بُتوں سے اجتناب کم ہوتا گیا۔ پھر بھی یوسفس یہودی حضرت عیسےٰؑ کے ورود کے زمانے میں بیان کرتا ہے کہ جب گلیلی کے علاقے کا نظم و نسق اس کے سپرد ہوا تو اس نے طبریس کی یہودی مجلس کو آمادہ کیا کہ وہ شاہ ہیرڈ اینٹی پاس کا محل مسمار کر دیں، کیونکہ اس میں جانداروں کی شکلیں تھیں۔ اور یہ امر خدا کے حکم کے خلاف تھا۔ اسی طرح جب رُومی حکمران پونطیوس پلاطوس یروشلم میں فوجوں کو لایا تو شہر نے اس اقدام پر اس بناء پر احتجاج کیا کہ رُومی جھنڈوں پر قیصرِ روم کی تصویر تھی اور انسانی تصویریں ان کے مذہبی احساسات کو مجروح کرتی تھیں۔ یہودی بادشاہوں کے سکّوں پر زیتون، پھول، خوشۂ انگور، سازِ موسیقی یا خود وغیرہ کی تصویر ہوتی تھی کبھی بادشاہ یا کسی اور جاندار کی تصویر نہ ہوتی تھی۔

لیکن شروع عیسائیت کے زمانہ کے جو یہودی مقبرے شہرِ رُوم میں کھودے گئے ہیں ان میں جانداروں کی تصویریں پتھروں پر تراشی ہوئی برآمد ہوئی ہیں۔ طیونس میں شہر کارتھیج کے قریب یہودی مقبروں کے کھنڈرات میں جنّوں، عورتوں، سواروں، اور شراب سازوں کی تصاویر نکلی ہیں۔ خود فلسطین میں ان یہودی معابد کے کھنڈروں میں جو غالباً سنہ عیسوی کی اوّلین صدیوں میں تعمیر ہوئے تھے شیروں۔ عقابوں، پَروں والے جنّوں اور انسانوں کی تصاویر ہیں۔ اس یہودی معبد میں جو دورا میں فرات کے کنارے واقع ہے اور جسے فرانسیسی اور امریکن آثارِ قدیمہ کے ماہروں نے کھودا، عہد نامۂ

قدیم کے پیغمبروں کی تصاویر موجود ہیں۔ یہ معبد اس میں کندہ عبارت کے مطابق ۲۴۵ء میں بنا تھا۔ اس میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ اور کشتیٔ نوح کے علاوہ حضرت موسےٰؑ کی تصویر بھی موجود ہے جو واقعی حیرت انگیز امر ہے۔ حضرت موسےٰؑ کے سر کے گرد ایک مربع روشنی ہے اور اُن کی وفات کے بعد کی تصویروں میں سیاہ رنگ کا مربع ان کے سر کے گرد ہے۔ یہودیوں کے خدا "یاھوَ" کو ایک ہاتھ کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے جو بادلوں سے باہر نکلا ہوا ہے۔

توریت میں حکم ہے "بُتوں کی جانب رُخ نہ کرو"۔ مگر رُومی سکّوں پر ہمیشہ قیصرِ روم یا اس سے پہلے قیصروں کی تصاویر ہوتی تھیں جو خدا بن چکے ہوتے تھے۔ ربّی فاھم بن سیمائی (قریب ۲۶۰ء) نے اس خیال سے تمام عمر کسی رُومی سکّے پر نگاہ تک نہ ڈالی، اور یہودی تاریخ میں اس کا لقب "مقدّس ترین ربّی" ہُوا۔ اسی زمانے میں ربّی جوشوا بن لیوی لکھتا ہے "آؤ اور دیکھو خدا اور انسان کے کاموں میں کتنا تفاوت ہے۔ انسان ایک تصویر بناتا ہے لیکن اس میں جان یا رُوح یا اندرونی اجزاء نہیں ڈال سکتا۔ خدا ایک جسم کے اندر دوسرا جسم بذریعہ حمل تیار کرتا ہے اور اس کے اندر جان اور رُوح اور اندرونی حصّے بناتا ہے"۔ عام مسلمانوں کا رویّہ بھی تصاویر اور بُتوں کے متعلق یہی رہا ہے۔

لیکن اس بُت پرستی سے محصور تہذیب میں بُت نوازی اور بُت پرستی بتدریج سرایت کر رہی تھی۔ مقبروں میں اور معابد میں مقدّس تصویریں بننی شروع ہو گئیں۔ گو عقیدہ بُت پرستی کے خلاف تھا۔ لیکن یہودی تہذیب ایسے بُتوں سے مانوس ہو رہی تھی۔ جنہیں وہ مقدّس سمجھتی تھی۔ اس لیے ہمیں کوئی حیرانی نہیں ہوتی۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ شمالی سلطنت کے آخری دنوں میں بچھڑے کے بُت کو خدائے واحد کا بُت سمجھ کر پُوجا جاتا تھا اور تمام یہودی پیتل کے سانپ کی پرستش کرتے تھے جو نعوذ باللہ ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے خیال میں حضرت موسےٰؑ کے حکم کے مطابق تھا۔ بقول یہودی روایت کے شاہ داؤد کے گھر میں فرشتوں کی تصاویر تھیں اور ایک انسانی بُت کی تقدیس و عبادت ہوتی تھی یعنی بُتوں سے اجتناب قطعی کی دینی تعلیم کے باوجود یہودی تہذیب اس درجہ تک پہنچ گئی کہ یہودی مساجد میں موسےٰؑ اور دیگر پیغمبروں کی تصاویر بننے لگیں۔ یہودی بادشاہ گھروں میں مقدّس بُت رکھنے لگے۔ اور یہودی آخر سانپ اور بچھڑے کو پُوجنے لگے مسلمانوں کے لیے یہودی تہذیب کی یہ کیفیات غور طلب ضرور ہیں۔ کیونکہ بنیادی عقائد میں اور اوّلین روایات میں اسلام اور یہودیت میں کوئی فرق نہیں ہماری تہذیب بھی آخری ایک صدی سے تصاویر اور بُتوں سے مانوس ہو رہی ہے۔ یادگار اور تقدیس کے جذبات ہماری تہذیب میں بھی بُت بنانے میں ظاہر ہونے لگ گئے ہیں۔ فردوسی اور کمال اتاترک کے بُت اسی رُوحانی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ غالباً پچھلی ہی صدی میں اس قسم کی باتیں اسلامی تہذیب میں ناممکن تھیں۔

عیسائی مذہب بھی یہودی روایت کی وجہ سے شروع میں بالکل بُتوں کے خلاف تھا۔ جب اوائل عیسائیت کا مشہور پادری ٹرٹولین کہتا ہے کہ موسوی قانون کے مطابق نہ صرف پرستشِ اصنام بلکہ صنم سازی کی بھی ممانعت ہے۔ تو وہ عیسائی اجتنابِ اصنام کو ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ بقول ٹرٹولین "خالق صداقت جھوٹ کو پسند نہیں کرتا۔ ہر قسم کا جھوٹ اس کی نگاہ میں گناہ کے برابر ہے"۔ یہ کلیسا کے اوّلین احکام میں سے ہے کہ رنگوں کی تصویریں بنائیں یا جو بُت بنائیں ان سے بپتسمہ لینا جائز نہیں۔ اس مذہبی سلسلہ کے احکام میں جو سینٹ کلیمنٹ سے منسوب ہے مصوّر کو فاحشہ ایکٹر چکلہ کے مالک کے ساتھ ایک زمرہ میں داخل کیا ہے سینٹ کلیمنٹ کے مطابق صنم ساز خدا کے دوسرے قانون کے علاوہ آٹھویں قانون کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے۔ جو یہ حکم دیتا ہے "تم چوری نہ کرو"۔ بقول سینٹ کلیمنٹ

"فنکار مصوّری یا سنگ تراشی سے خدا کی قوتِ خلقت چرانا چاہتا ہے اور اپنے آپ کو جانوروں اور پودوں کا خالق ظاہر کرتا ہے"۔ یہاں پودوں کے ذکر سے ظاہر ہے کہ عیسائیوں کا اجتناب صنم سازی شروع میں مسلمانوں سے بھی ایک قدم آگے تھا۔ مشہور پادری اوری گن ایک معیاری سلطنت کا فرضی نقشہ پیش کرتا ہے۔ لیکن اس میں مصوّروں اور صنم تراشوں کی کوئی جگہ نہیں کیونکہ بقول اوری گن "تصاویر بنانا بے وقوفوں کی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے اور رُوح کی آنکھوں کو آسمان سے زمین کی طرف کھینچتا ہے"۔ علاوہ ازیں یوں بھی عیسائی عقیدہ کے مطابق تمام غیر عیسائی بُت خبیث رُوحوں کی آماجگاہ تھے۔ یہ عقیدہ قرونِ وسطیٰ میں بھی عام تھا۔

لیکن پہلی سات صدیوں میں عیسائی بُتوں کو اسی طرح پُوجنے لگ گئے جس طرح کہ کبھی مشرک اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو پُوجتے تھے۔ البتہ وہ عیسےٰؑ اور مریم کے بُتوں کی پُوجا کو دوسرے بُتوں کی پُوجا سے حضرت عیسےٰؑ اور ان کی مقدّس والدہ کی برتری کی بناء پر بہتر عبادت ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کیتھولک فرقہ کے لوگ اس پرستش کو اوّلین عیسائی آثارِ قدیمہ کی تصاویر پر مبنی کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان یادگاروں میں حضرت عیسےٰؑ کی کوئی تصویر نہیں۔ اگر حضرت عیسےٰؑ کی پرستش بُتوں کے ذریعے عام ہوتی تو ان یادگاروں میں ان کی صورت سب سے زیادہ تعداد میں ہوتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ عیسائیت کی پہلی تین صدیوں میں صلیب بحیثیت ایک مخصوص عیسائی نشان کے موجود نہیں۔ غالباً رومی قیصر کونسٹین ٹائن عیسےٰؑ کے بُتوں اور صلیب کا موجد تھا۔ سب سے پہلی مصلوبِ عیسےٰؑ کی تصویر حضرت عیسےٰؑ سے چار سو سال بعد کی ہے اور رُوم میں سینتا صابینا کے گرجے کے دروازے پر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فرضی تصویر ہے کیونکہ روایت موجود نہ تھی اور عیسےٰؑ کی اس تصویر سے بہت مختلف ہے جو موجودہ وقت میں رائج ہے۔ چوتھی صدی میں شہر الویرا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہسپانیہ میں منعقدہ پادریوں کی مجلس کے چھتیسویں[۳۶] قانون کے مطابق "گرجا میں کوئی تصویر نہیں ہونی چاہیئے تاکہ مقدس صورتیں دیواروں پر نہ بن جائیں"۔

اپی فانیوس نے جو ۳۶۷ء سے ۴۰۳ء تک جزیرہ قبرص کے شہر سالامس کا بشپ تھا غصے میں آکر فلسطین کے ایک گرجا میں ایک پردہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کیونکہ اس پر ایک مقدس تصویر تھی۔

مگر آہستہ آہستہ بُت پرستی عیسائیت میں داخل ہوتی گئی اور بُت پرستی کے طرفداروں نے ساتویں صدی تک کلیسا کی عبادت میں غلبہ حاصل کرلیا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں خدا باپ کی تصاویر بھی بننے لگ گئیں اور یورپ کے کئی گرجوں اور عجائب خانوں میں آج تک موجود ہیں۔ ان تصاویر میں خدا باپ ایک سفید ریش بوڑھے کی شکل میں ہوتا ہے اور باوجود اس کے کہ سینٹ آگسٹائن عیسائی اولیاء کی تصاویر کی پرستش کی مذمت کرتا ہے۔ عیسائی اولیاء کی تصاویر بھی بننے لگ گئیں اور ان کی تصاویر اور ہڈیوں کی پرستش آج بھی کیتھولک عیسائی عبادت میں داخل ہے۔

تصویروں اور بُتوں کے متعلق اسلام کا ردِّ عمل ہمیں معلوم ہے۔ جو جو مذہب اسلام سے دوچار ہوئے ہیں ان پر اسلام کے اس رویّے کی صداقت کا گہرا اثر ہوا ہے۔ ان مذاہب میں اسلام کے زیرِ اثر بُتوں کے متعلق شرمساری سے دو اثرات رُونما پذیر ہوئے۔ بُت پرستی پر اسلام سے زیادہ قوّی اور منظّم حملہ کبھی نہ ہوا تھا۔ اس لیے دوسرے مذاہب کو بُت پرستی قائم رکھنے کے لیے بُت پرستی کی تشریح کرنی پڑی، جس سے بُت پہلے کی طرح خُدا نہ رہے بلکہ مظہرِ خدا یا خدا کے محض روایتی نشان رہ گئے۔ بُتوں کے علاوہ بھی ساری فطرت کو مظہرِ خدا یا نشانِ خدا کہا جا سکتا ہے اور فطرت کے ہوتے ہوئے اور مظاہر یا نشانات بنانا کچھ بے سود سا معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال اس تشریح سے بُتوں کی وقعت میں کمی ضرور ہوئی۔ دوسرے یہ کہ دوسرے مذاہب میں ایسے فرقے بن گئے جنہوں نے اسلامی نقطۂ نظر کو تسلیم کیا اور بُت پرستی کی عقیدہ کے لحاظ سے مذمت کی۔

آنحضرتؐ کے وصال کے قریباً ایک سو سال بعد جب اسلام کی تعلیم چاروں طرف عام ہوئی تو اسلام کے عقائد کے مقابلہ میں عیسائیوں کو اپنی بُت پرستی پر انتہائی شرمساری ہوئی۔ قسطنطنیہ کے رُومی قیصر لیو سوئم (۷۱۷ء سے ۷۴۰ء تک) نے بُت پرستی کے خلاف قانون پاس کیے اور گرجا کے بُتوں کو توڑا اور اس کے عمل سے عیسائی دُنیا میں بُت پرستی اور بُت شکنی پر بحث شروع ہوگئی۔ پاپائے رُوم نے ہمیشہ بُت شکنی کی مخالفت کی۔ لیکن لیو سوئم سے ایک سو سال تک پاپائے رُوم کے خلاف مشرقی رُومی بُت شکنوں کی بغاوت قائم رہی۔ آخرکار قیصر تھیوفلس کی وفات (۸۴۰ء) کے بعد بُت پرستوں کی طاقت مشرقی عیسائیت پر پھر غالب آگئی۔

عیسائی دنیا میں دوسری بغاوت پروٹسٹنٹ فرقہ کی ہے، جس کا بانی جرمن پادری مارٹن لوتھر ہے۔ غالباً ہم لوتھر کی بُت شکنی کی تعلیمات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ اگر ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ جس زمانے میں مارٹن لوتھر کلیسائے رُوم کی بُت پرستی اور دیگر توہّمات کے خلاف بغاوت کر رہا تھا۔ اس وقت اسلامی خلافت کی حدود اس کے وطن جرمنی کی حدود سے ملی ہوئی تھیں۔ لوتھر نے جو کچھ اسلام کے خلاف بھی کہا ہے اس سے اس کی اسلام کے بنیادی اصولوں سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ زمانہ عیسائی تعصّب کا زمانہ تھا۔ اور عیسائی دُنیا میں کوئی غیر عیسائی زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ اس عیسائی دُنیا میں رہتے ہوئے لوتھر اتنا ہی اسلامی اثر قبول کر سکتا تھا جتنا اس کی تعلیمات سے ظاہر ہے اور یہ بھی عیسائی دنیا میں ایک زبردست انقلاب کے لیے کافی تھا۔ لوتھر نے بُت پرستی اور دیگر عیسائی توہّمات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی زبردست مخالفت کی اور اس طرح اسلامی صداقت کے فیوض کی حدود عیسائی دُنیا میں وسیع ہوگئیں۔ افسوس ہے کہ آنے والی نسلوں نے مارٹن لوتھر کی تعلیمات کی پاکیزگی کو کمزور کر دیا۔

ہندوستان میں ویدانت، برہمو سماج، آریہ سماج اور سکھ مت نے بھی اسلامی تعلیمات کے فیوض کو غیر اسلامی دنیا میں بکھیر دیا۔ یہ سب مذاہب عقیدہ کے لحاظ سے کم و بیش بُت پرستی کے مخالف ہیں۔

لیکن جب اسلام ہی موجودہ رَو میں بہ کر رفتہ رفتہ بُتوں سے مانوس ہو جائے گا تو پھر دُنیا کی تہذیبوں کی کیا حالت ہوگی صرف قیاس سے تعلق رکھتا ہے۔ بہرحال بُتوں کے متعلق اسلام کے موجودہ ترمیم شُدہ رویّے کو سمجھ لینا اسلامی روایات میں دِل چسپی رکھنے والوں کے لیے ضروری ہے۔ دوسرے مذاہب میں اس قسم کی تحریکیں بُت پرستی پر منتج ہوئیں۔ اس لیے اسلام کے متعلق غور کرتے ہوئے ہمیں دوسرے مذاہب کی تاریخ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے تاکہ ہمارے نتائج علم کی کمی کی وجہ سے جذباتی غلطیوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

اسلام میں جانداروں کی تصاویر ہمیشہ ممنوع رہی ہیں۔ البتہ ایرانی مصوّروں نے گاہے گاہے جانداروں کی تصاویر بنائی ہیں۔ شروع میں ایسی تصاویر کی گردن پر ایک خط ہوتا تھا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ یہ قتل شُدہ جاندار ہیں اور مصوّر سے مواخذہ نہ ہو۔ خواہ تصویر انہیں زندگی کی حرکت میں دکھائے۔ بعد میں یہ خط نظر ہی نہیں آتا۔ ایران مذہبی روایات میں باقی دُنیائے اسلام سے علیحدہ ہی رہا ہے نیز ایسی تصاویر صرف معدُودے چند اُمراء کے پاس ہوتی تھیں۔ عوام ہمیشہ بُتوں اور تصاویر سے اجتناب کرتے رہے لیکن تمام دُنیا میں مسلمان غالباً پچھلی ایک نسل میں ہی بُت نوازی کی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ جس کی بڑی وجہ اسلامی دُنیا کی یہ خواہش ہے کہ

ہم نہایت جلد ہر پہلوئے حیات میں یورپ کے برابر ہو کر موجودہ احساسِ مغلوبیّت سے نجات حاصل کریں۔ ورنہ ہم بُتوں سے اس وقت بھی واقف تھے جب بُت پرست ہمارے محکوم تھے۔ ان صدیوں میں ہمارے رویّے میں اتنا انقلابی فرق نہ پیدا ہُوا۔

یہ بھُول نہیں جانا چاہیئے کہ اس احساسِ مغلوبیّت کی بڑی وجہ مغلوبیّت ہی ہے۔ جس کے وجوہات اور جس کے دُور کرنے کی تجاویز اس کتاب کے پہلے مقالہ میں بیان ہو چکی ہیں۔ صرف آزاد اور طاقتور قوم ہی اپنی تہذیب کی حفاظت کر سکتی ہے۔ ڈری ہوئی و سہمی ہوئی اقوام طاقت ور اقوام کے عناصرِ تہذیب کی آسان نقل میں وہ برابری ڈھونڈھتی ہیں جو صرف عناصرِ قوّت کے حصول سے میسّر ہو سکتی ہے۔ لہٰذا موجودہ افسوسناک سیاسی حالات میں ہمارے لیے اپنی روایات کے تغیّرات پر نگاہ رکھنا ہماری پاکیزہ اسلامی تہذیب کے بقاء و تسلسل کے لیے بہت ضروری ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

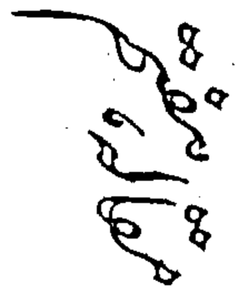

www.KetabFarsi.com
مجموعه بزرگ کتاب فارسی شامل هفت آزار لازن مکتبه
محکم دلائل سی مزین متنوع و منفرد موضوعا

www.KitaboSunnat.com

مقالہ ہفتم

ایک اور خیال جو ہمارے انحطاط کے زمانہ میں اسلامی دُنیا پر مسلّط ہو رہا ہے وہ تقدیسِ نسل ہے۔ اگرچہ یہ خیال دنیا میں بہت پرانا ہے پھر بھی موجودہ صورت میں یورپ میں شروع ہوا اور رفتہ رفتہ اسلامی ممالک میں بھی سرایت کر گیا۔ اِس خیال کے مطابق یورپ کی سفید آریہ نسل دُنیا کی اعلیٰ ترین نسل ہے۔ لیکن خود یورپی مصنّف بلند نسل کے دائرے کو اتنا وسیع کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ان کے مطابق یورپ کے لوگوں میں تین بڑی نسلیں ہیں۔

اوّل :۔ نارڈک یعنی شمالی۔ یہ نسل سویڈن۔ ناروے۔ ڈنمارک اور شمال مغربی جرمنی میں زیادہ تر پائی جاتی ہے۔ یہ "خالص آریہ" نسل ہے۔ سفید رنگ۔ لمبے سر۔ نیلگوں آنکھیں اور بلند قد اس نسل کی خصوصی صفات ہیں۔ اس نسل کو "ٹیوٹن" نسل بھی کہتے ہیں۔

دوم :۔ الپائن یعنی پہاڑی نسل۔ یہ نسل درمیانی یورپ کے پہاڑی علاقوں میں موجود ہے۔ ان کے سر گول ہوتے ہیں اور قد چھوٹے۔

سوم :۔ بحیرۂ رُوم کی نسل جسے یورپ میں "میڈیٹرینین" نسل کہتے ہیں۔ ان کے رنگ اور آنکھوں میں سیاہی پائی جاتی ہے۔ ان کے بال بھورے یا سیاہ ہوتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ نسل جنوبی یورپ میں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ آخری دونوں نسلیں جنوبی راستوں کے ذریعے ایشیا سے یورپ میں داخل ہوئیں۔ بحیرۂ روم کی نسل مشرقی نسلوں کے زیادہ قریب ہے۔ نیز مشرقی یورپ میں سلاوی نسلیں ہیں اور مغربی یورپ میں "آئی بیرین"۔ یورپ کے شہروں کے ناموں میں قدیم ترین آبادی کے اثرات ہیں۔ غرض یورپ میں کئی نسلیں ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں نارڈک نسل کی برتری کا چرچا بہت زیادہ ہے[1] اور تاریخ کی تشریح اس طرح کی جارہی ہے کہ ہر ملک کے حکمران و اکابرین سفید نارڈک خون کے لوگ ثابت کیے جائیں۔

فرانسیسی[2] مفکر لاپوژ یورپ کو مذکورہ بالا تینوں نسلوں میں تقسیم کرکے بیان کرتا ہے کہ سوسائٹی کی ترقی ہر جگہ اور ہر وقت ادنیٰ نسلوں پر اعلیٰ نسلوں کے حکمرانوں کی فتح کے ذریعے ہوئی ہے جو ادنیٰ نسلوں کو مفید غلامی میں جکڑے رکھتے ہیں۔

قوموں میں نسلی احساس کے ساتھ ساتھ یہ دو خیال ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ان کی نسل خالص نسل ہے اور یہ حالت غالباً دنیا میں کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔ دوسرے یہ کہ نسلی فرق بنیادی فرق ہے۔ نسلی احساس کے ساتھ عام طور پر دوسری نسلوں سے نفرت اور دوسری نسلوں پہ شک کے جذبات بہت تیز ہوتے ہیں۔ جسمانی اور دماغی ساخت کے فرضی تعلقات تصوّر کرلیے جاتے ہیں۔ اکثر اس قسم کا خیال چند سیاسی حلقوں کی طاقت کے قیام و تسلسل کے لیے بہت مفید ہوتا ہے اور سیاسی تعصّبات کو علمی و عقلی بنیادیں مہیّا کردیتا ہے۔

---

[1] یہ مقالہ ۱۹۳۸ء میں پڑھا گیا۔ جب کہ ہٹلر کی جرمنی میں "نارڈک" نسل کی برتری کا زبردست پروپیگنڈہ کیا جارہا تھا۔

[2] LAPOUGE : THE FUNDAMENTAL PRICIPLES OF ANTHROPO SOCIOLOGY

کئی مفکّر زبان کی یکسانیت کو نسل کا امتیازِ خصوصی بتاتے ہیں لیکن کئی دفعہ مختلف قومیں ایک زبان رکھتی ہیں مثلاً افریقہ کے سفید بربر اور نیگرو اپنے آپ کو عرب تصوّر کرتے ہیں اور عربی بولتے ہیں اور اسی طرح ریاست ہائے متحدہ کے نیگرو اور امریکن انگریزی زبان بولتے ہیں اور کئی دفعہ ایک نسل کے لوگ مختلف زبانوں میں کلام کرتے ہیں۔ مثلاً بربر عربی بولتے ہیں اور اُن کے ہم نسل اسپانوی ایک رومی زبان۔ غرض زبان اور نسل کی مطابقت قطعی نہیں بلکہ اکثر مرتبہ گمراہ کُن ہے۔ ہر ملک میں نسلیں کئی ہوتی ہیں اور زبان اکثر ایک۔

فرانس میں کاونٹ گوبینو اور انگلستان میں ایچ ایس چیمبرلین نے پچھلی صدی میں اس نظریّے کو فروغ دیا کہ ٹیوٹن یعنی نارڈک نسل کے لوگ دُنیا کی اعلیٰ ترین نسل ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ نظریہ درست ہے تو دنیا کی تاریخ فقط یہی ہوسکتی تھی کہ تمام تہذیب و تمدّن کے آثار شمالی یورپ سے شروع ہوتے اور باقی دُنیا ہزاروں سال ان شمالی نسلوں سے فیض یاب ہوتی رہتی۔ حالانکہ واقع یہ ہے کہ یہ نسلیں چند صدیوں پہلے وحشی تھیں۔ ان کی تہذیب یونان و روم کی مرہونِ منّت ہے اور ان کا مذہب فلسطین کے یہودی حضرت حضرت عیسےٰؑ کی پرستش ہے۔ تاریخ کی اس تلخ حقیقت کو مٹانے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ پرانے یونانی اور رومی نارڈک تھے۔ مگر پرانے یونانی اور رومی بُتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نارڈک نسل کے لمبوترے سر نہ رکھتے تھے بلکہ ان میں سے اکثر گول سروں والے تھے۔ سقراط اور افلاطون کے مجسمے اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔ نیز یونانی اور رومی تاریخ و ادب میں سفید رنگ اور سنہری بال صرف شاذ ہی بیان ہوتے ہیں اور وہ بھی شاعری کے طور پر۔ مگر اس قسم کے حوالے تو ہماری شاعری میں بھی پائے جاتے ہیں اور چینی شاعری میں بھی کہیں کہیں ملتے ہیں، ہیروڈوٹس یونانی مؤرّخ جب ایک اجنبی قبیلے کا ذکر کرتا ہے جس کے لوگ نیلگوں چشم اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سنہرے بالوں والے تھے تو وہ صاف بیان کرتا ہے کہ یہ لوگ یونانیوں سے مختلف النوع ہیں۔ یہاں تک کہ یونانی خدا زیوس۔ ہیرا۔ پوسائڈن سیاہ گیسوؤں والے تھے۔ پالس ایتھینی دیوی کی نیلی آنکھیں بقول پوسانیاس اس کی ہوا پر حکومت کا نشان ہیں۔ یونانی برتن جن پر یونانیوں کی سیاہ تصاویر ہوتی ہیں۔ ان کے نارڈک ہونے کی تردید کرتے ہیں۔ یونانیوں کی شکلیں ایشیائی ہیں اور شمالی یورپ سے قطعی مختلف ہیں ان کے خداؤں کے قصے بھی ایشیائی خداؤں کی کہانیوں کے قریب ہیں اور سکنڈے نیویا کے خشک اور بہادر خداؤں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ غالباً یہ لوگ اس وقت جب کہ بحیرۂ ایجن کے جزیرے اس خشکی کا حصہ تھے جو یونان کو ایشیا سے ملحق کرتی تھی ایشیا سے یونان کو ہجرت کر گئے تھے اور یونانی تہذیب جزیرہ کریٹ کی اس شاندار تہذیب کا عکس تھی جس کے آثار قدیمہ موجودہ زمانے میں رونما ہو کر اسے یونان کی تہذیب سے بھی اعلیٰ ثابت کر رہے ہیں۔

اسی طرح روم ایٹرسکن نسل کے باشندوں کا شہر تھا جو ایک ایشیائی نسل تھی۔ یہی حال اندلسی نسلوں کا ہے جو بعد میں آئرلینڈ اور فرانس میں پھیل گئی۔

جرمن فاضل[1] ورتھ اپنی کتاب "نسل اور قوم" میں ظاہر کرتا ہے کہ خود شمالی یورپ میں غیر آریہ تہذیب کے آثار زبان اور مذہب اور شہروں کے ناموں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

مگر نسلی فلسفی کی زبان بندی نہیں کی جا سکتی ہے۔ جرمن ولٹمن یہ مانتے ہوئے کہ نارڈک نسل دوسری نسلوں سے مخلوط ہو چکی ہے۔ تمام غیر معمولی دماغوں کو صرف نارڈک خون سے منسوب کرتا ہے۔ اس کے لیے لوتھر۔ گوئٹے۔ بیتھوون۔ مائیکل انجلو۔ رافیل۔ دانتے اور شیکسپیئر سب کی عظمت صرف نارڈک خون کی بدولت ہے۔

[1] A. WIRTH : RASSE AND VOLK

اگرچہ یہ خون اس کے نزدیک ان مثالوں میں میڈیٹرینین خون سے مخلوط ہو چکا ہے۔ اور اس کے نظریے کے مطابق یہ سب حضرات "دوغلے" ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حالت میں خالص نارڈک نسل کے اہلِ دماغ ان لوگوں سے بھی زیادہ شاندار آدمی ہونے چاہئیں۔ وہ کون کون ہیں؟ دوسرے یہ کہ یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ بحری نسل کے خون کا ان کی عظمت میں کوئی حصہ نہیں۔ لیکن بقول والٹمن کے یہ نارڈک نسل کی بڑائی ہے کہ باوجود ملاوٹ کے نارڈک خون نے ایسی عظیم الشان ہستیاں پیدا کیں۔ اس کے بعد کیا کہا جا سکتا ہے۔

پترارک اطالوی شاعر تصاویر میں گربہ چشم ہے لیکن والٹمن کا خیال ہے کہ اطالوی نارڈک نیلی آنکھیں زرد رنگ سے ہی دکھایا کرتے تھے۔ مگر کیا اطالوی مصور نیلے رنگ سے ناآشنا تھے؟ ظاہر ہے کہ دلیل یا مثال کی ضرورت نہیں اور پترارک جیسے بڑے شاعر کو غیر نارڈک مان لینا بھی درست نہیں۔ اسی طرح اریوستو کے بال اور آنکھیں سیاہ تھے۔ مگر بقول والٹمن جسم سفید تھا جو اس کے ٹیوٹن ہونے کی دلیل ہے۔ حالانکہ یورپ کی ادنیٰ نسلوں کے جسم بھی سفید ہوتے ہیں۔ بسمارک۔ لوتھر۔ نیپولین۔ رافیل۔ بیتھوون۔ شوپرٹ۔ سب گول سروں والے تھے جو ان نارڈک فلسفیوں کے نزدیک ادنیٰ نسل کی خصوصیت ہے۔ گوئٹے کی آنکھیں اور بال سیاہ تھے۔ بیتھوون چھوٹے قد کا تھا۔ اس کا نچلا جبڑا بڑھا ہوا تھا۔ ناک چوڑی تھی۔ معلوم نہیں کہ یہ نسلی فلسفی اسے کس طرح نارڈک خصوصیات سے آراستہ کر دیتے ہیں۔ پشکن روسی شاعر کا دادا زارِ روس کا نیگرو غلام تھا اور فرانس کے مشہور مصنف دوما میں نیگرو خون تھا۔

نارڈک یورپ کی جنتری بابل سے لی ہوئی ہے۔ ان کے تحریری حروف فینشی یعنی شامی ہیں۔ ہندسے عربوں کے ذریعے ہندوستان سے پہنچے ہیں۔ مذہب فلسطین سے قبول کیا ہے۔ قوانین رومی لوگوں سے جو ایشیائی ہیں اور جسمانی طور پر نارڈک خصوصیات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ رکھتے تھے۔ فلسفہ یونانیوں سے لیا ہے جو نہ صرف خود ایشیائی اور سانولے رنگ کے تھے بلکہ اپنی تہذیب کے لیے مصر۔ بابل اور کریٹ کے مشرقی لوگوں کے مرہونِ منّت تھے۔ سائنس نارڈک نسلوں نے عربوں سے حاصل کی۔ ان کے شہروں کے اکثر نام غیر ٹیوٹنی ہیں۔ پھر بھی ایک جرمن نسلی مفکّر فشر نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ ٹیوٹن لوگ دوسروں کے عناصرِ تہذیب و تمدّن کو قبول نہیں کرتے۔ اور ایک اور جرمن مفکّر گنتھر کہتا ہے "تخلیقی روح صرف نارڈک نسل کا ورثہ ہے"۔ مگر یہ تخلیقی روح خالص نارڈک لوگوں میں کیوں شان و شوکت سے ظاہر نہیں ہوتی۔ کیونکہ خود گنتھر کے مطابق اِبسن میں بھی پہاڑی خون کی آمیزش تھی۔ اور اگر ہٹلر[1] اور اُس کے ہم خیال جرمن مفکّروں کا یہ نظریہ درست ہے کہ نسلی امتزاج سے اعلےٰ نسلوں میں تنزّل پیدا ہوتا ہے تو یورپ کی تمام اعلےٰ ترین ہستیاں غیر نارڈک خون کی ملاوٹ والی کیوں ہیں اور خالص نارڈک خون والے اکابرین کی فہرست کسی نسلی مفکّر نے کیوں مرتب نہیں کی؟

نسلی غرور عجیب و غریب دعاوی میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔ بقول چیمبرلین وفاداری ٹیوٹن یعنی نارڈک نسل کا خاصہ ہے۔ مگر وفاداری کی مثالیں ہر قوم اور ہر ملک کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ جاپانیوں کی ہراکیری راجپوتوں کی جوہر کی رسومات انہیں نارڈک ثابت نہیں کرتیں۔ جب جنوبی افریقہ کی سفید حکومت کی طرف سے ایک سیاہ فام سردار سندیلی کو پکڑوانے پر ایک ہزار جانور کے انعام کا اعلان ہوا تو ایک نیگرو بھی نہ نکلا جو اس پیش کش پر ذرا بھی غور کرتا۔

بقول چیمبرلین "ٹیوٹن لوگوں نے سب سے پہلے دُنیا کو ذاتی آزادی کا نظریہ پیش

[1] ADOLF HITLER : MEIN TKAMPF . CHAPTER.XI

کیا"۔ ذاتی آزادی غالباً جتنی افریقہ کے نیگرو لوگوں میں موجود ہے کسی مہذّب قوم میں موجود نہیں ہو سکتی۔ عرب بھی اس دعوے میں ٹیوٹن لوگوں سے کم نہیں۔ قانونی آزادی کی مثالیں یونانیوں۔ رومی شہروں۔ ہندی پنچایتوں اور سرحدی جرگوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

کئی مرتبہ نارڈک لوگوں کی برتری کے ثبوت میں ان کی عورتوں کی بلند حیثیت کا ذکر بھی کیا جاتا ہے کہ وہ کثیر الازدواج نہ تھے۔ یہ غلط ہے کیونکہ فاضل شرّاڈر[2] ان کی کثیر الازدواجی کا ذکر کرتا ہے۔ شاہ داگوبرت کی تین منکوحہ بیویاں تھیں۔ اگرچہ وہ عیسائی تھا۔ لونڈیاں اس کے علاوہ تھیں۔ شاہ شارلیمن کی بیٹیاں بلا خاندوں کے صاحبِ اولاد تھیں اور اس میں کوئی قباحت نہ سمجھی جاتی تھی۔ ٹیوٹن بیویاں بالکل خاوندوں کی ملکیّت تھیں اور اسی طرح استعمال ہوتی تھیں۔

کئی مرتبہ یہ کہا جاتا ہے کہ عیسائیت کا غیر منطقی نظریہ ٹیوٹن لوگوں کے نسلی طبائع کے مطابق ہے اور عیسائیت کی قبولیّت ان کے اعلےٰ نسل ہونے کا ثبوت بن جاتا ہے۔ مگر عیسائیت تمام دُنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور کروڑوں ایشیائی بھی اس مذہب کو اپنی رُوح کے مطابق خیال کرتے ہیں۔ نیز ملک حبش میں عیسائیت ٹیوٹن لوگوں کی عیسائیت سے بھی پرانی ہے اور حبشی نارڈک لوگوں سے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ ٹیوٹن لوگوں کی عیسائیت کا ذکر کرتے ہوئے سیاسی حالات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ٹیوٹن سردار کلوڈک نے قسم کھائی کہ اگر وہ حریف پر غالب آیا تو عیسائیت قبول کر لے گا۔ وہ حریف پر غالب آگیا۔ ٹیوٹن بادشاہ ریکارڈ نے اعلان کیا کہ اس کی کیتھولک عیسائیت کی قبولیّت محض سیاسی مصلحتوں کے تحت ہے۔ شاہ شارلیمن نے سیکسن جرمن امیروں کو عیسائیت قبول کرنے کی صورت میں بڑے بڑے علاقے دینے کا وعدہ کیا اور جن

[2] SCHRADER : INDOGERMANEN

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جرمنوں نے عیسائیت قبول کرنے سے انکار کیا ان کو بے دریغ قتل کر دیا۔ ابھی تک عیسائیت صرف رومی کیتھولک تھی۔ مگر چیمبرلین کیتھولک عیسائیت کو "ٹیوٹن روحوں پر مذہبی تشدد" سمجھتا ہے اور پروٹسٹنٹ "بدعت" کو "ٹیوٹن روح کی جنگِ آزادی" تعبیر کرتا ہے۔ لیکن کئی عیسائی مفکر ان دونوں نظریوں سے اتفاق نہیں رکھتے۔ دو جرمن فاضل ڈِہرنگ اور ہارٹمن نالاں ہیں کہ عیسوی مذہب کے ذریعے ادنےٰ یہودی ذہنیت ٹیوٹن روح میں داخل ہو گئی۔

چیمبرلین عیسائی بھی ہے اور نارڈک پر مغرور بھی ہے۔ اس لیے یہودی عیسےٰ کی پرستش اس کے لیے شاق ہے۔ لہٰذا وہ عیسےٰ کو سفید آریہ نارڈک نسل سے ثابت کرنا چاہتا ہے اور اس کے پیرو عیسےٰ کو نارڈک ہی خیال کرتے ہیں۔ مگر ہم عصرِ یوسف یہودی کی "جنگ یہود" جس کے پرانے سلاوی ترجمہ کا نسخہ حال ہی میں برآمد ہوا ہے، کی دوسری جلد میں حضرت عیسےٰؑ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ غیر شکیل اور درمیانہ قد اور لمبی ناک والے تھے۔ ان کی بھویں جڑی ہوئی تھیں اور ان کے سر پہ کافی بال نہ تھے۔ خود چیمبرلین کا نارڈک حُسن کا معیار اس سے کچھ مختلف ہو گا۔

ظاہر ہے کہ نسلی مفکروں میں ایک ہی نسل کی برتری پر اعتماد رکھتے ہوئے بھی اتفاق رائے موجود نہیں۔ نسلی تعصبات انہیں ایسے نتائج پر پہنچا دیتے ہیں جو آپس میں مخالف ہوتے ہیں۔

جرمن ڈریسمین جنسی بداخلاقی کو غیر آریہ روایت قرار دیتا ہے۔ جرمن ایمسن جنسی بداخلاقی کو ٹیوٹن نسل کی "روحانی زندگی کی فطری تندی" کا ایک پہلو خیال کرتا ہے۔ چیمبرلین جرمن فیلسوف کانٹ کو ٹیوٹن روح کا ترجمان خیال کرتا ہے۔ آٹو ولمن کے خیال میں کانٹ کو "جرمن" فلسفی کہنا بے ہودگی ہے کیونکہ وہ روسو کے بین الاقوامی فلسفہ سے متاثر ہے۔ چیمبرلین سپنوزا کو "آریہ پن کا دشمن اور اصلی یہودی" کہتا ہے۔

شاپن ہاور سپنوزا کی "آریہ روح" کے گُن گاتا ہے۔ چیمبرلین کے خیال میں مشاہدہ و تجربہ کے علوم ٹیوٹن لوگوں نے ایجاد کیے۔ ڈریسمین کے مطابق ٹیوٹن روح ان عمیق اور عظیم صداقتوں کی دلدادہ ہے جو مشاہدہ و تجربہ کی حدود سے بہت آگے ہیں۔ اکثر نارڈک مفکر فن میں نارڈک نسل کی خصوصیت دیکھتے ہیں۔ گوبینو سیاہ نسلوں کو تصور اور فن میں نارڈک نسلوں سے بڑھا ہوا خیال کرتا ہے۔ والٹمن اور چیمبرلین "ریتے سانس" یعنی "تحریک احیاء العلوم" میں ٹیوٹن نسل کی روحانی خصوصیات کا اظہار دیکھتے ہیں۔ گوبینو اسی تحریک کو رومی تہذیب کی فتح اور ٹیوٹن تہذیب کی شکست خیال کرتا ہے۔ چیمبرلین کو کیتھولک رومی عیسائیت اور نپولین کی قیصریت میں ٹیوٹن نظریہ کی بربادی نظر آتی ہے۔ والٹمن ان دونوں اداروں میں ٹیوٹن عظمت کا اظہار پہچانتا ہے۔

نسلی نظریوں کا یہ مضحکہ انگیز اختلاف ظاہر کرتا ہے کہ نسلی نظریے قومی خود پسندی کو تسکین دینے اور سیاسی تعصبات کو علمی بنیادیں مہیا کرنے کے لیے بنتے ہیں نسلی برتری کے دعوے اکثر دوسری نسلوں سے مستقل ناانصافی کی علمی دلیل بن جاتے ہیں اور "ادنےٰ" نسلوں کو اپنی ادنےٰ قسمت پر قانع رکھنے کی تلقین کا پہلو بھی نکل آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آریہ اقوام کے لیے یہی آرام دہ ہے کہ شودر اقوام ان کی محکوم رہیں اور ان کی خدمت اور اپنی ذِلّت کو نہ بدل سکنے والی قسمت خیال کریں۔

تاریخ میں جس قوم نے بھی ترقی کی ہے اس نے اپنی نسلی برتری کا دعوےٰ کیا ہے۔ انسانی خود پسندی ایک عام صفت ہے۔ چینی۔ ہندو۔ روسی۔ مصری سب اپنی اپنی جگہ بلند نسل ہونے کے دعوے دار ہیں۔ بقول ہٹلر یورپ میں نسلی تعصب کی زیادہ تر ذمہ داری یہودیوں پر عائد ہوتی ہے۔ جو یورپ کی عیسائی برادری میں رہتے ہوئے ہمیشہ اپنے آپ کو خدا کی "برگزیدہ" اور "منتخب" نسل سمجھتے اور کہتے رہے مگر بلند نسلوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے سب دعوے دار اُس اخلاقی بلندی سے بہت نیچے ہیں جو اسلام سکھاتا ہے۔ اسلام میں سب بھائی بھائی ہیں اور ایک ماں اور ایک باپ کی بکھری ہوئی اولاد ہیں۔ رنگ اور ذات اور نسل کی کوئی تمیز نہیں۔

آخری چند صدیاں یورپ کی ترقی کی صدیاں ہیں اور اسلام کا پسِ منظر نہ ہوتے ہوئے مغرب کے نسلی دعاوی کی بنیاد وہ اقتدار ہے جو موجودہ زمانے میں یورپ کو حاصل ہے۔ وہ عناصرِ قوّت جن کی بدولت یورپ نے یہ تاریخی حیثیت حاصل کی ہے مقالۂ اوّل میں درج ہو چکے ہیں۔ مگر عناصرِ قوّت کی غلط تشریح (مقالۂ دوم) کے تحت یورپ کے نسلی نظریّوں کی خرافات مسلمانوں کے طرزِ خیال کا حصّہ بن رہی ہے۔ "مشرقِ قریب" میں اس کے سیاسی نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ محض یورپ کے تتبّع میں غالباً اس خیال سے کہ نسلی فلسفہ بھی یورپ کی ترقی کا باعث ہے اور یورپ کی قوت کا عنصر ہے۔ اسلام کے پیرو اپنی بین الاقوامی برادری اور قوت کو کمزور کر رہے ہیں۔ دُنیائے اسلام کی باہمی تاریخ نسلی تاریخوں میں منقسم ہو رہی ہے۔ یورپی مؤرّخ بوجوہ اس کارِ خیر میں مناسب امداد بہم پہنچاتے ہیں۔ براؤن کی "فارس کی ادبی تاریخ" بھی اس میلان کی مثال بن سکتی ہے۔ ڈاکٹر براؤن کئی جگہ عربی زبان کے ادیبوں کو ان کی ایرانی نسل کی بناء پر ایرانی ادیب ظاہر کرتے ہیں۔ ترکی۔ حجازی۔ ایرانی۔ افغانی۔ مصری اور جاوی جو صدیوں بھائی بھائی رہے اور بلا امتیازِ نسل رشتے جوڑتے رہے آج نسلی رعونت کا شکار ہیں۔ قوموں کے اندر ذاتوں اور ملکوں کے اندر صوبائی خیالات نے اس مسئلہ کو اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔ موجودہ دَور اسلام کے امتحان کا دَور ہے۔ ہمیں اُس تحریک[1] سے سبق لینا چاہیئے جو اس صدی کے آغاز میں عرب عیسائیوں نے یورپ کے ایماء پر "احیائے عرب" کے نام سے شام میں

[1] GEORGE ANTONIUS : THE ARAB AWAKENING

شروع کی اور جس کی رَو میں بہ کر پہلی عالمی جنگ کے دوران میں عیسائی یورپ سے ساز باز کر کے عرب نسل پرستوں نے تُرک خلیفۃ الاسلام کے خلاف بغاوت مکّہ سے شروع کی۔ تُرک شہید کیے گئے اور عرب شریفِ مکّہ نے انگریزی سفیر میکماہن سے خفیہ معاہدہ میں فلسطین کو یہودیوں کے نیشنل ہوم لینڈ کے لیے مخصوص کرنا تسلیم کر لیا۔ اس بدقسمتی کے نتائج صدیوں میں ختم نہ ہوں گے۔ حالات کی درست تشریح اور اپنے ذہنی تغیّرات کے درست احساس کے بغیر ہم اُن بین الاقوامی خصوصیّات کو قائم نہ رکھ سکیں گے جو اوائلِ اسلام سے پچھلی نسل تک اسلامی زندگی کا سرمایۂ ناز رہی ہیں۔

حکمران اقوام عام طور پر اپنی نسلی برتری کی ہوا اپنے دماغ میں بھر لیتی ہیں اور اُن سیاسی اور مادّی حالات کو نظر انداز کر دیتی ہیں جس کے تحت ہر نسل کے لوگ ان کی تاریخ کو دُہرا سکتے۔ نسلی فلسفیوں کے غرور غالباً اسی صورت میں کم ہو سکتے ہیں۔ جب کہ دُنیا میں عناصرِ قوّت ایسے انسانوں کے ہاتھ رہیں جن کے نزدیک تمام انسان بھائی ہیں۔ اور نسل و قوم فقط پہچان کے لیے ہیں برتری کا ثبوت نہیں۔

لیکن اگر چند حضرات کے شکوک بلا مغرب کی سند کے دُور نہ ہو سکتے ہوں تو اُن کے لیے یہ بیان کر دینا مناسب ہے کہ یورپ کی علمی تفتیش نے بھی موجودہ یورپ کے نسلی فلسفہ کو بے بنیاد ثابت کیا ہے۔ مثال کے لیے ہمیں ایسے یورپی ملک کو لینا چاہیئے۔ جہاں نسلی تفاوت انتہائی ہے۔ یعنی ریاست ہائے متحدہ جہاں سفید امریکی اور سیاہ فام آزاد شدہ نیگرو غلام اکٹھے بستے ہیں۔ پروفیسر آرتھر میکڈانلڈ[1] سکول کے بچّوں پر دراز تفتیش کے بعد مندرجہ ذیل نتائج پر

[1] ARTHER MAC DOWNALD : MAN AND ABNORMAL MAN.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہنچے ہیں :۔

نوعیتِ نسل	ذہین طالب علم	اوسط درجہ کے ذہن والے طالب علم	کُند ذہن طالب علم
سفید امریکن لڑکے	۳۷۶۵ فیصد	۴۲۶۳ فیصد	۲۰۶۲ فیصد
سیاہ نیگرو لڑکے	۴۷۶۲ //	۳۳۶۵ //	۱۹۶۲ //
سفید امریکن لڑکیاں	۴۵ //	۴۶ //	۹ //
سیاہ نیگرو لڑکیاں	۶۹ //	۳ //	۲۸ //

ظاہر ہے کہ فطرت کی طرف سے نیگرو قوم سے کوئی بے انصافی نہیں کی گئی۔ ملکوں کی آب و ہوا۔ کشمکش کی ضروریات۔ قوموں کا میل جول۔ تاریخی مذہبی معاشرتی روایات اور سیاسی حالات سے قوموں کی ترقی و پسماندگی کی بڑی حد تک تشریح ہو سکتی ہے۔ اعلےٰ اور ادنےٰ نسلوں کا نظریہ غیر علمی نظریہ ہے لیکن موجودہ زمانے میں جب کہ سیاست و سائنس یورپ کی سفید اقوام کے قبضے میں ہیں ان میں نسلی غرور کا پیدا ہو جانا باعث حیرت نہیں۔ اگر ہم مناسب سعی سے ان حالات کو بدل سکے تو یہ نظریہ خود بخود بدل جائے گا۔ جاپان کی ترقی نے ہی اس نظریہ میں تغیرات پیدا کر دیئے تھے اور جاپان کی منگول قوم کو جرمنی نے سرکاری طور پر "نصف آریہ" مان لیا تھا۔ غرض جو قوم عناصرِ قوت پر قبضہ حاصل کرے گی وہ تاریخ میں آگے بڑھ جائے گی۔ اس میں نسلی امتیاز محض غیر ضروری گفتگو ہوگا۔

جرمن فاضل فریڈرک راٹزل اپنی کتاب "انتھنالوجی" میں بیان کرتا ہے کہ دُنیا کی تمام نسلوں میں ذہنی مشابہت ہے اور تہذیب کی مختلف سطحوں پر تمام نسلیں ایک ہی قسم کے حالات ظاہر کرتی ہیں۔ اس فاضل کی علمی تفتیش اس کو ان نتائج پر پہنچاتی ہے:۔

"انسان ایک ہے۔ اس کی مختلف قسموں میں اختلافات ہیں لیکن یہ اختلافات گہرے نہیں ہیں۔"

"نسل کو مہذب ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔"

جرمن فاضل فیلکس خاں کوشن کے مطابق :۔

"بنیادی طور پر کوئی نسل ادنےٰ نہیں ہے۔ مختلف نسلوں کے اخلاقی و دماغی اختلاف اُن اختلافات سے کم ہوتے ہیں جو اکثر ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں پائے جاتے ہیں۔"

جرمن فاضل دلہلم ونڈٹ[1] لکھتا ہے کہ :۔

"علمِ انسانی ثابت کرتا ہے کہ انسانی دماغ کے قوائے تخلیق اور وہ احساسات و جذبات جو ان قواء پر نتیجہ خیز اثر رکھتے ہیں۔ تمام ملکوں اور علاقوں کے لوگوں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔"

آنحضرتؐ کا وہ فرمان کتنا سبق آموز ہے۔ جس میں آپؐ نے اپنی بیٹی فاطمۃ الزہراؓ سے ارشاد کیا کہ "تمہیں پیغمبرؐ کی بیٹی ہونا نہیں بخشوائے گا تمہارے عملوں کا امتحان ہوگا"۔ یعنی خداوند تعالےٰ کے نزدیک "اعلیٰ ترین نسل" میں ہونا باعثِ امتیاز نہیں بلکہ امتیاز اور بخشش عملوں سے ہے۔ یہی حال اس دُنیا کا ہے۔ اسلام کا مستقبل اُن درست عملوں سے منسلک ہے جو مناسب تشریح و انتخاب کے بعد پاک ضمیر سے کیے جائیں۔

---

[1] VOLKERPSYCHOLOGIE

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقالہ ششم

تہذیب اسلامیہ کے کچھ اور پہلو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مضمون طویل ہو گیا ہے اور ممکن ہے کہ چند حضرات کے لیے یہ طوالت بارِ خاطر ہوئی ہو۔ مگر ان مقالات کو ختم کرنے سے پہلے تہذیبِ اسلامیہ کے چند اور پہلوؤں کا ذکر مجملاً کر دینا غالباً غیر مناسب نہ ہوگا ورنہ یہ مضمون بہت دراز ہے اور ان چند مقالات میں صرف مختصر اشارات ہیں۔

شراب خوری:۔ مسولینی اور ہٹلر شراب سے محترز رہتے تھے۔ سٹالن بھی شراب سے پرہیز کرتا تھا۔ برنارڈ شا اس کے نزدیک نہیں جاتا تھا۔ یورپ اور امریکہ میں ٹمپرنس کی زبردست تحریکیں جاری ہیں۔ مگر عیسائی ممالک میں شراب پینا بند نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ گرجا میں شراب پینا عیسائی نماز کا حصہ ہے۔ عیسائی روایت کے مطابق حضرت عیسےٰؑ نے مصلوب ہونے سے پہلے اپنے حواریوں کو دعوتِ الوداع دی۔ جس میں انہوں نے ان کے سامنے شراب اور روٹی رکھ کر اپنے مصلوب ہونے کے امکان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے استعارۃً کہا کہ "اے دوستو! یہ شراب جو تم پی رہے ہو یہ میرا خون ہے اور یہ روٹی میرا گوشت ہے۔" جس طرح عیسائیت سے پہلے مشرک مذاہب میں خدا کو جسم میں داخل کرنا روحانی طاقت کا باعث سمجھا جاتا تھا[1]۔ اسی طرح حضرت عیسےٰؑ کے اس ارشاد کے مطابق آج

---

[1] شراب پینے سے انسان کی شخصیت بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یونانی اس حالت سے سمجھتے تھے کہ خدا انسانی جسم میں داخل ہو گیا ہے۔ یونانی زبان میں THEOS بمعنی خدا ہے جس سے انگریزی لفظ ENTHUSIASM مشتق ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک گرجا میں شراب اور روٹی کو نوش کرنا مقدّس ترین عبادت ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ خدا سے ایک ہونا ہے۔ یعنی عیسےٰ ابنِ مریم سے وجودی وحدت حاصل کرنا ہے۔ جب انگریزوں کے وقت میں شراب نوشی کے خلاف ہندوستان میں قانون جاری کیا گیا تو الٰہ آباد کے عیسائی بشپ نے احتجاج کیا کہ اس قانون کے نفاذ سے عیسائی مذہب میں دخل اندازی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یورپی ممالک شراب کے مخرب الاخلاق اثرات سے بخوبی واقف ہیں اور اس بدعادت کے خلاف جدّوجہد کرتے رہتے ہیں[1]۔

موجودہ سیاسی حالات کی غلط تشریح کے باعث اور نقل سے "عیسائی مغرب" کی برابری حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں میں بھی شراب خوری عام ہو رہی ہے اور اس شان سے کہ پیرس۔ لندن اور برلن سے کہیں زیادہ شراب کے اشتہار قاہرہ میں نظر آتے ہیں۔ شمالی الجیریا کے "مہذب" الجیری اور مشرقِ قریب کے "ترقی یافتہ" مسلمان

[1] ۱۹۶۵ء میں شائع کتاب :-

DR. NEIL KESSEL & DR. HENRY WALTON : ALCOHOLISM

کے مطابق دماغی امراض کے ہسپتالوں یعنی پاگل خانوں میں داخلے کی سب سے بڑی وجہ شراب خوری ہے۔ بہت سے حادثے اور خودکشی کی وارداتیں شراب خوری کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ شراب خوری سے جگر کی مہلک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ شراب خوری مسلسل جسمانی اور دماغی تنزّل کا باعث ہے۔

ڈیلی نیوز کراچی کی ۱۹ جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں اے پی پی خبر رساں ہے کہ نیشنل کونسل آن الکحلزم کی آخری رپورٹ کے مطابق انگلستان میں دو سو پچاس ملین پونڈ سالانہ کا نقصان شراب خوری کی وجہ سے کام کرنے والوں کی غیر حاضریوں اور دوسرے مُضر اثرات کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہر پیر کو ڈھائی لاکھ آدمی اتوار کی شراب خوری کی وجہ سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ شراب خوری کے عادی مزدور سال میں چالیس سے ساٹھ دن تک کا کام ضائع کر دیتے ہیں۔

شراب خور ہیں۔ جب میں انقرہ کا شہر دیکھ چکا تو میں نے ایک تُرک سے دریافت کیا کہ کیا کوئی اور قابلِ دید جگہ انقرہ میں باقی رہ گئی ہے؟ تو اس نے مجھ سے پُوچھا "کیا تم نے ہمارا سب سے بڑا شراب خانہ دیکھا ہے؟"

مجھے معلوم ہوا کہ حکومت ترکی نے سات شراب خانے ترکی میں کھول رکھے ہیں اور ترکی ریڈیو پر گاہے گاہے شراب کی صفات ترکوں کو سمجھائی جاتی ہیں کہ یہ رنگ لال کرتی ہے۔ گرمیوں میں سردی اور سردیوں میں گرمی پہنچاتی ہے۔ تمام مہذّب اقوام شراب پیتی ہیں۔ ترک بھی اب یورپین ہو گئے ہیں۔ حکومت نے ان ضروریات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے شراب خانے جاری کیے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

مولوی :- موجودہ زمانے میں مولویوں کے مقدّس طبقہ کے متعلق بہت سے قابلِ ہذیان سرائی کی گئی ہے۔ داڑھا۔ تنیا۔ ملنٹا۔ جمعراتیہ۔ حلوہ مانڈہ خور۔ گنبد نما پگڑ پوش کے الفاظ استعمال کیے بغیر ان کا تذکرہ مشکل ہو گیا ہے۔ مولوی قوم کو گمراہ کرتے ہیں۔ ترقی کے دشمن ہیں۔ قومی تنزّل کا باعث ہیں۔ گندے غسل خانوں اور موٹی مسواکوں کے مالک ہیں۔ دقیانوسی یادگاریں ہیں۔ منافق ہیں۔ قومی جونکیں ہیں وغیرہ۔

ہمیں احسان مندی سے یاد رکھنا چاہیئے کہ جب ہم نے غلط تشریح (مقالہ دوم) کے تحت یورپ سے عناصرِ قوت کی بجائے عناصرِ تہذیب و تمدّن کو اختیار کرنا شروع کیا تو مولویوں نے صدائے احتجاج بلند کی اور ہم نے ان کے اسی جُرم کی وجہ سے اپنی غلطی کو نہ پہچانتے ہوئے مولویوں کو ترقی کا دشمن گردانا۔ یہ بھی باعثِ حیرت نہیں کہ مولویوں کے متعلق سخت سے سخت الفاظ انہی کے "ترقی پسند" افراد کی جانب سے استعمال کیے گئے۔ جب کبھی غلط تشریح کے تحت اسلامی روایات میں رخنہ اندازی ہوئی، اِن مولویوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر قوم کے افراد نے اس کی پروا نہ کی اور قرآن کے حافظوں۔ رسولؐ کی شریعت کے مفسّروں اور واعظوں کی جگہ قومی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشرت میں نائیوں۔ درزیوں اور ہوٹلوں کے خدمتگاروں نے لے لی۔

یہ صرف ان مولویوں کے احتجاج کی بدولت ہے کہ مغربی تعلیم جو شروع میں مغربی مذہب کی تبلیغ سے متعلق تھی آج ہمارے لیے صرف عناصرِ قوت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ مقابلہ کے لیے یہ امر نظر انداز نہ کر دینا چاہیئے کہ ہندوستان میں ہندو قوم نے بہت سے فائدوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے شروع میں مغربی تعلیم کو بلا احتجاج قبول کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس تعلیم کی بدولت یورپی حکمرانوں کے ماتحت ملک کی داخلی حکومت میں حصّہ دار ہو گئے۔ مگر اس عمل میں ہندو قوم نے آخری تین چوتھائی صدی میں قریباً ایک کروڑ ہندو نذر کر دیئے۔ جو آج ہندوستانی عیسائی ہیں۔ اور جاہل مولوی نے قوم کو اس سانحہ سے بچا لیا۔

ہم اس تہذیبی نقصان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو ہمیں مسجد سے تعلیم کو علیحدہ کرنے میں ہوا۔ اسلامی اداروں میں آج مسجد ایک غیر متعلق الحاق کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اسلامی عہد میں طالبانِ علم مسجد کے مکتبوں کی جانب رجوع کرتے تھے اور قرآن۔ فقہ۔ تفسیر کے ساتھ ساتھ جغرافیہ۔ تاریخ۔ منطق۔ ریاضی۔ طبّ وغیرہ کی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ جب زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات نے اس تعلیم کو ناکافی ثابت کر دیا۔ تو مناسب یہی تھا کہ مسجدوں میں مناسب تعلیم یافتہ مولوی مقرر کیے جاتے جو مسلمانوں کو تعلیمی لحاظ سے مغربی تعلیم کے برابر پہنچا سکتے۔ مسجدوں میں دارالتجارب بڑھا دیئے جاتے تاکہ علومِ فطرت کی اسلامی روایات جو ہلاکو خاں کی تباہ کاریوں سے برباد ہو گئیں پھر زندہ ہو سکتیں۔ آخر مکاتب میں یونانی اور لاطینی کی تعلیم بھی ہوتی رہی تھی۔ انگریزی اور فرانسیسی کی تعلیم میں کیا قباحت تھی۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ مکتب مسجدوں سے علیحدہ ہو گئے اور تعلیم نے جو اسلام کی تہذیبی طاقت کی ضامن تھی اسلامی مذہب کے حریف کی صورت اختیار کر لی۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں یہ اصلاح

آج بھی ممکن ہے اور ہمیں ضرور اس کی جانب متوجہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اکثر طالب علم جو غیر اسلامی ماحول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ اخلاقی تنزّل اور سیاسی پریشانی کا باعث ہیں۔ ان میں ایک روحانی انتشار ہے۔ ایک تہذیبی و تمدّنی غیر مرکزیت جو اُس قومی طاقت کی قاطع ہے جو صرف افرادِ اقوام کے نسلاً بعد نسلٍ ہم خیال ہونے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اگرچہ اسلامی سلطنت کے زوال کے وقت قریباً ساری قوم اَن پڑھ ہو چکی تھی۔ صرف مولویوں کے تقدّس کی روایات نے قوم کو انتشار سے بچائے رکھا۔ کروڑوں گنوار مسلمان صرف بچّے کی پیدائش کے وقت مسجد میں جاتے تھے اور مسجد کے مُلّا سے بچّے کا نام تجویز کرا لیتے تھے اور غالباً اس اسلامی نام کے سوا اِن کے پاس اسلام کا اور کوئی نشان نہ ہوتا تھا۔ آج ہم ان ناموں کی بدولت اِس قوم کو مسلمان کہتے ہیں اور خدا کی مہربانی سے اس قوم کو مسلمان رکھنے والے مولوی کو حقیر سمجھتے ہیں۔ آج بھی ہزاروں مساجد کے تاریک حجُروں میں رہنے والے دلق پوش مولوی رات کو گھر گھر بھیک مانگنے جاتے ہیں اور کُتّے ان پر بھونکتے ہیں اور ان کی عورتیں ہمسایوں کی چکّیاں پیس کر مزدوری کرتی ہیں اور چیتھڑوں سے تن ڈھانپتی ہیں۔ یہ سلوک ہے جو قوم ان لاکھوں مولویوں سے کرتی رہی ہے۔ جنہوں نے غربت اور کس مپرسی کی حالت کے باوجود ہماری نسلوں کو مسلمان رکھا اور جن کے بغیر علاقوں کے علاقے دائرہ اسلام سے خارج ہو چکے ہوتے۔ ہم غلط تشریح کی وجہ سے ایسے سلسلۂ حیات میں جکڑے جا چکے ہیں کہ مولوی صرف ڈنر۔ افسر کی خوشامد۔ سینما۔ جلسے۔ چائے وغیرہ کے مشاغل میں بدذیب رکاوٹ معلوم ہوتے ہیں۔ ہم معاشرت کے دونوں پہلوؤں میں اعتدال قائم نہیں رکھ سکے اور یہ سطحی زندگی گذارتے ہوئے ہم اپنے روحانی افلاس کو صرف مولویوں کی مخالفت میں ڈھانپنا چاہتے ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ مولویوں کی اعلیٰ تعلیم اور ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حالت کی اصلاح کی جانب غور کیا جائے تاکہ مساجد اسی طرح مسلمانوں کی مذہبی۔ تعلیمی، معاشرتی زندگی کا مرکز رہیں۔ جیسے کہ گذشتہ نسلوں میں رہی ہیں اور جب تک مولوی کا وقار ہماری معاشرت قائم نہیں ہوگا۔ ہماری نسلیں اسلامی زندگی کی حامل نہ رہ سکیں گی۔

پیر و مُرشد:۔ جس طرح مولوی مسلمانوں کے دینی و علمی استاد ہیں اسی طرح پیر رُوحانی رہنما تھے۔ باطنی دانش و رازِ تفکّر کی آخری منزل ہے لیکن وہ احساسِ حقیقت جو باطنی دانش پر مبنی ہو دوسرے دل میں یا دلیل سے منتقل کیا جا سکتا ہے یا محض ایمان سے۔ دلیل نہ صرف ایک فن ہے بلکہ قبول کرنے والے میں درست استدلال کی قوت فرض کرتی ہے۔ لہٰذا زندگی کے اعلیٰ ترین حقائق و نکات کئی مرتبہ محبّت اور ایمان کے زینہ سے ایک دل سے دوسرے دل میں اُتر جاتے ہیں اور اس امر کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ محض منطق زندگی کی تمام جذباتی اور اخلاقی پیچیدگیوں کو سُلجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

لیکن لوگوں کی رُوحانی ضروریات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اِس اختلاف کی بناء پر اگر کئی حضرات پیروں کو غیر ضروری خیال کریں تو کوئی عجیب بات نہیں۔ خود اعتمادی اور علم کوشی قابلِ قدر صفات ہیں۔ زندگی کے حالات کئی مرتبہ حقائق باطنیہ کی طرف مائل ہونے کے موافق نہیں ہوتے۔ ایک مضبوط مزاج انسان رُوحانی سہارے کی ضرورت کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مگر ایسے حضرات کا یہ فرض کر لینا کہ سب لوگ ان کی طرح ہیں اور وہ خود معیاری حیثیت رکھتے ہیں ایسی بے انصافی ہے جیسی کہ اہلِ طریقت کا یہ خیال کہ سب لوگ جو ان سے مختلف ہیں وہ ناقص اور مجرم ہیں۔

یہ عام مشاہدہ ہے کہ دلیل سے قبول کیا ہوا عقیدہ کئی مرتبہ اتنا محکم نہیں ہوتا جتنا کہ

ایمان سے پیدا کیا ہوا یقین۔ کیونکہ دلیل مسئلہ کے دونوں طرف دی جا سکتی ہے اور کبھی خواہش کے ماتحت ہو کر عجیب عجیب قلابازیاں کھانے لگتی ہے گو انسانی فطرت و حیات میں اخلاقی و رُوحانی ارتفاع کے راز مُضمر ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ کئی مرتبہ ہم ان اسرار سے ناآشنا رہتے ہیں۔ جب تک ایسے تجربے یا ایسی شخصیت دوچار نہ ہو جائیں جو ہماری روح میں اعلےٰ زندگی کی خواہش اور قبولیّت پیدا کر سکے۔

یہ بھی مسئلہ ہے کہ کچھ انسان دوسرے انسانوں کے دل و دماغ پر نفسیاتی قابو حاصل کر لینے کی قابلیّت رکھتے ہیں۔ وہ بزرگ جنہوں نے اپنی نیکی اور خلوص اور محبّت اور عبادت سے مسلمانوں کی رُوحوں پر حاصل کردہ قابو کو صدیوں اسلامی اور اخلاقی مفاد کے لیے استعمال کیا۔ وہ پیر صدیوں نوکھوں مسلمانوں کے لیے عقیدہ کی وجہ اور الہام کا ثبوت تھے۔ ان کی مصاحبت اطمینانِ قلب اور آزادیٔ خاطر کا درس تھی۔ ان کی خوشنودی لاکھوں مسلمانوں کے اخلاق کی ضامن تھی۔ اس قلیل محدود زندگی کے پیچھے دوام اور لامکاں کا پسِ منظر پیش کر کے یہ روحانی اُستاد اسلامی زندگی میں اعتدال اور توازن قائم رکھتے تھے اور اسلام کی عالمگیر تبلیغ اِنہی پیروں کی کرامات ہے۔

لیکن آج ہم اپنی قوم کی سیاسی ہزیمت کی وجہ سے اپنی اکثر روایات کو باعثِ خفّت خیال کرتے ہیں۔ ہر قوم کی قبروں کو احترام سے ہی دیکھنا چاہیئے۔ نپولین۔ صلاح الدین غازی۔ لینن کی قبریں اپنے اپنے زائرین کے لیے روحانی کیفیات کی منبع بن سکتی ہیں۔ لیکن ہم پیروں کی قبروں کے احترام کو قبر پرستی کے مبالغہ آمیز الزام سے مطعون کر کے قابلِ مذمّت قرار دیتے ہیں۔ وہ زندگیاں جو شبِ عزلت میں شمعِ عبادت کو زندہ رکھتی ہیں اور ہمارے درمیان موجود ہوتے ہوئے اپنی نادر روحانی دُنیا میں جلاوطن رہیں۔ وہ بزرگ جنہوں نے فقر اختیار کیا اور اسلام کی دولت کو کافی سمجھا،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ جن کی ریاضت اور چلّہ کشی آنحضرتؐ کی روحانی سلطنت کو دُنیا میں وسیع کرتی رہی آج ہم اُن کی تقدیس کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ پیر اکثر غازی یا دینی اُستاد ہوتے تھے۔ اُن میں سے کئی غریب دستکار اور مزدور تھے اور کئی عالمانِ دین تھے۔ مگر سب اسلام کی رُوحانی دولت کے بکھیرنے والے تھے اور عبادت گذار تھے۔ کیا اُن کے سوانحِ حیات آج کل کی مادّہ پرست دُنیا میں کوئی روحانی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔

مگر کیا کسی شراب خور، جواری، جھوٹے، منافق، ظالم یا بدکردار انسان کو دینی رہنما یا پیر و مُرشد بنایا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسے اشخاص جو خود ہدایت و اصلاح کی ضرورت رکھتے ہیں دوسروں کو رُشد و ہدایت سے مستفیض نہیں کر سکتے۔ عقیدت اور بے وقوفی میں فرق ہے۔ اور عقلِ سلیم کا دُنیا میں کوئی بدل نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ آج پیروں میں وہ پہلی خصوصیات پائی نہیں جاتیں۔ کچھ اس لیے کہ پیری مریدی رسمی وراثت بن گئی ہے اور کچھ اس لیے بھی کہ آج تہذیبی انقلاب کی وجہ سے ان خصوصیات کے ڈھونڈنے والے کم ہو گئے ہیں لیکن آج بھی ہم میں ایسی ہستیاں موجود ہیں جو خواہ وہ پیر کہلائیں یا نہ کہلائیں رُوحانیت کا مرکز ضرور ہیں۔

پیروں کا اتنا ادب کہ شرح کی حدود سے متجاوز ہو جائے ناجائز ہے۔ کیونکہ ایسا ادب اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے۔ خواہ دینی رہنما کا ہو خواہ سیاسی یا فوجی رہنما کا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے آئندہ نسلوں کے رہنماء علم فضل اور نیکی سے آراستہ ہوں۔ کیونکہ دینی اُستادوں اور رہنماؤں کی ضرورت کسی نہ کسی صورت میں ہر نسل کو ہمیشہ رہے گی۔

ستی:۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسا وقت بھی آیا جب کہ ہندو مسلمانوں

کو انگریزوں کے نیچے نائب حکمران معلوم ہوتے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اُن دنوں ستی کی ظالمانہ رسم کی تعریف مسلمانوں کی تقریروں اور ادب میں عام ہونی شروع ہو گئی۔ برہمن کے حکم سے ہندو قوم ہزاروں سال اپنی کروڑوں ارلوں بچّی، بُوڑھی یا جوان بیواؤں کو ان کے خاوندوں کی لاشوں کے ساتھ زندہ جلاتی رہی۔ برہمن کے خدائی حکم سے، رُومانی وفاداری کے پردے میں، شادی ہندو عورت کے لیے ایک خوفناک عذاب بن گئی تھی۔ ہندو دھرم دیوتاؤں کی کہانیوں سے کچھ اتنا پیچیدہ بن گیا ہے کہ برہمن جو بھی کہہ دیں ایک ہندو کو اس پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ستی کے عذاب سے بچنے کا طریقہ ایسے خاوند سے شادی تھی جو مر نہ سکے بلکہ امر ہو۔ برہمن کے پاس ایسے خاوند مندروں کے دیوتا تھے۔ جو بیویاں بطور دیوداسیاں قبول کرنے کو تیار تھے۔ نتیجہ یہ کہ ہر نسل میں لاکھوں والدین ہندو کنیاؤں کو دیوداسیاں بنا کر مندروں میں برہمنوں کے پاس چھوڑ جاتے تھے۔ بڑے بڑے مندروں کے ساتھ چالیس چالیس ہزار دیوداسیاں ہوتی تھیں جو مہنتوں، پنڈتوں، برہمنوں، چیلوں اور فیّاض یاتریوں کے کام آتی تھیں اور اُن کی اولاد خدا کی اولاد یعنی ہریجن تھی۔ گاندھی جی نے یہ خطاب اچھوتوں کو بھی دے دیا۔ اسی مقدّس روایت کے تحت پوری کے مندر اور دوسرے مندروں میں آج بھی ہزاروں دیوداسیاں موجود ہیں۔

برہمن کی غلامی کا احساس اب کچھ ہندوؤں کو ہو رہا ہے۔ ۲۳ مئی ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں پاکستان کے اخبار "ڈان" (DAWN) میں ہندوستان کے مشہور مصنّف نیراد چودھری نے اخباری نامہ نگاروں کے ایک سوال پر کہ اس کی ہندوستان کے مہارشی اور پوری کے شنکر آچاریہ کے متعلق کیا رائے ہے؟ جواب دیا کہ "ہندوستانی سادھو طاقت کے متلاشی ہیں۔ وہ ذہنی لحاظ سے غلیہ پانا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہتے ہیں۔ جب اُن کے چیلے اپنی لڑکیوں کے بیاہ کے متعلق مشورہ چاہتے ہیں تو وہ اپنی طاقت دکھانے کے لیے رشتے تڑوا دیتے ہیں۔ تین چوتھائی گرو اپنے چیلوں کے خاندان کی عورتوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور چیلے ان کے ایسے مطالبوں کو پورا کرنا باعثِ برکت اور ثواب سمجھتے ہیں۔ تم ہمارے دھرم کی بدراہی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

شہنشاہ اکبر اعظم سے غالباً ہندو مہاراجوں نے اس لیے اپنی راجکماریاں خوشی سے بیاہ دیں کیونکہ اُنہیں اپنی بیٹیوں کے لیے ستی یا دیوداسی ہونے کی بدقسمتیوں کے سوا اور کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی۔

یہاں قابلِ ذکر بات صرف یہ ہے کہ جب مغلوبیت کی شرمساری نے مسلمانوں کی قوتِ تشریح کو متزلزل کر دیا تو ہر طاقت ور قوم کی خوفناک بدقسمتی اور انسانیت سوز بات بھی اُنہیں خوبی اور نیکی نظر آنے لگ گئی۔ (۱۹۷۰ء)

نیا ادب :- ہمارے ادب پر بھی تہذیب کی غلط تشریح کا گہرا اثر ہوا ہے جسے جدّتِ رومان۔ ترقی پسندی کے حسین لفظوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ کبھی اس کو زندگی اور انقلاب کی مجبوری سمجھ لیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مقالے اصل میں مذہبی روایات کے متعلق ہیں۔ اس لیے میں نئی شاعری کے متعلق چند الفاظ پر اکتفا کروں گا۔

اس "نئی شاعری" کا اسلوبِ بیان انگریزی سے مستعار ہے۔ بلینک ورکس یعنی نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد میں نئے شاعر اپنے خیالات بیان کرتے ہیں۔ یعنی اگر انگریز شاعروں نے اپنے خیالات اس طرح بیان کیے ہیں۔ اگر انگریز شاعر اس قسم کی نظم لکھ سکتے ہیں تو ہم بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں۔ یہ کیفیت تحت الشعوری طور پر کارفرما ہے۔ غلام کی آقا سے برابری کی خواہش۔ حالانکہ غلام و خواجہ میں لباس و اطوار کا فرق اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا غلامی و خواجگی کا۔ یہ رویّہ اسی طرزِ خیال کا ادبی پہلو ہے جس کے تحت ہم نے حکّام سے خنزیر خوری، رقص و شراب۔ بے پردگی و

صنم نوازی کو حاصل کر کے اپنے آپ کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُردو میں غالباً یہ ترقی پسندی کبھی نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد میں ظاہر نہ ہوتی اگر ہم ہندوستان میں فرانس یا ہسپانیہ کے محکوم ہوتے جن اقوام کی شاعری بے قافیہ نظم اور نظمِ آزاد کو قبول نہیں کرتی۔ لہٰذا نیا ادب اُردو ادب کی قدرتی ترقی نہیں بلکہ حکام کے تتبّع کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔ ورنہ بے قافیہ سنسکرت شاعری ہمارے ملک میں صنم پرستی اور بے پردگی کی طرح ہزاروں سالوں سے موجود ہے۔ ہم نے پہلے کبھی اس طرز سے فائدہ نہ اٹھایا۔

کہا جاتا ہے کہ نیا ادب زندگی کو ادب سے وابستہ کرتا ہے اور موجودہ منقلب زمانہ کی تصویر ہے۔ مگر کیا موجودہ شاعروں میں سے کسی شاعر نے انقلاب کو اقبالؒ سے زیادہ محسوس کیا ہے؟ اس کے اشعار میں مزدور انقلاب آزادی کے حق میں اور سرمایہ داری اور غلامی کے خلاف کیا کچھ موجود نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان مضامین کے لیے آزاد نظم فطری اور فنی مجبوری ہوتی تو اقبال سے بہتر آزاد نظم لکھنے والا کوئی شاعر موجود نہ ہوتا۔

یورپ کبھی اس روحانی اور فنّی ضبط و استقلال تک نہیں پہنچ سکا جو اعلیٰ ترین ایشیائی غزل میں ظاہر ہے وہ موسیقی کا انتظار و جذبات کی دھار وہ دو مصرعوں میں طوفانِ حیات کی دُنیا جو غزل میں موجود ہے مغربی نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد کی نثر یا مغربی شاعری کی مسلسل نگاری میں حاصل ہونا ممکن نہیں۔ ایک پرانی اور پیچیدہ تہذیب کی پیچیدہ نفسیاتی کیفیات جب موسیقی و تناسب کے ضبط میں ادا ہوتی ہیں تو جذبات کی تندی سے وہ احساسِ حُسن و اضطراب پیدا کرتی ہیں کہ مغربی شاعری میں اس کی مثال شاذ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی شاعری اپنے ہی مرغوب مضامین کی ادائیگی میں اقبال کی شاعری کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

ان مضامین کے علاوہ جو قدرِ مشترک نئے ادب میں پائی جاتی ہے وہ فحاشی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عُریانی ہے۔ لیکن یورپ کے اعلیٰ ترین شاعروں کے شاہکاروں میں یہ فحاشی اور عُریانی موجود نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نیا ادب یورپ کے ادنےٰ درجے کے ادب کا تتبّع ہے۔ فکر ہر کس بقدرِ ہمّت اوست۔ کئی مرتبہ اس ادبی روّیے کو "رومان" کہہ دیا جاتا ہے۔ اور یہ لفظ ہی نئے ادب کے حق میں کافی دلیل معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر روایت کے خلاف بغاوت رومان ہے۔

اوّل یہ کہ بغاوت ایک قابلِ مذمّت جبر کے خلاف ہوتی ہے۔ خاص کر وہ جبر جس کے خلاف انسانی ضمیر احتجاج کرنے پر مجبور ہو۔ کیونکہ دُنیا کپڑے پہنتی ہے اِس لیے آدم زاد کا ننگا ہو کر پھرنا نہ بغاوت ہے نہ رومان کیونکہ یہ مقبولیّت کی سطح سے گرا ہُوا فعل ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا کپڑے پہن لینا واقعی قابلِ مذمّت جبر ہے؟ نیز یہ کہ کیا اگر سب برہنہ ہو جائیں تو یہی کپڑے پہن لینا درست ہو جائے گا اور حسین بغاوت اور رومان ہوگا؟ اس طرزِ خیال سے تو جو کچھ بھی ہے غلط ہے اور جو ہوگا وہ غلط ہوگا۔ زندگی کی خوبصورتی۔ معاشرت کا رکھ رکھاؤ اور انسانیّت اِسی میں ہے کہ لوگ لباس پہنے رہیں۔ یہی حال طرزِ بیان کا ہے۔ ماں باپ کے رشتے کی ضرورت سے زیادہ تصریح بیوی اور بہن کے فرق کو بیان کرتے رہنا عریاں نگاری اور فحاشی ہرگز جائز بغاوت کی عظمت اور پاکیزگی نہیں رکھتی بلکہ بغاوت کے مقدّس لفظ کا منہ چڑاتی ہے اور اس بے وقوفی کی دلچسپی رکھتی ہے جو صرف ادنےٰ لمحوں کی مصروفیت ہو سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ نئے ادب نویسوں نے لفظ رومان کے صحیح مفہوم کو مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس کے سطحی فروعی اور ناکافی مطلب سے زیادہ نہیں جانتے۔

لفظ "رومان" پہلے رومی زبان کی شاخوں کے لیے استعمال ہُوا یعنی فرانسیسی، اطالوی،

ہسپانوی وغیرہ کے لیے۔ پھر ان خصوصیّات کے لیے استعمال ہونے لگا جو قرونِ وسطیٰ میں ان زبانوں کے ادب میں پائی جاتی تھیں۔ کیونکہ رومانی خصوصیات کلاسیکی یعنی قدیم یونانی و لاطینی ادب کی خصوصیّات سے مختلف ہیں۔ اس لیے ان دونوں میں تضاد کا پہلو نکل آیا۔

قرونِ وسطیٰ میں رومانی زبانوں کا عنصرِ اعظم وُہ داستانیں تھیں جن میں غیر معمولی واقعات اور نادر حادثات بیان ہوتے تھے اور جن کی قریب ترین مثالیں مشرقی ادب میں الف لیلہ۔ داستانِ امیر حمزہ۔ بوستانِ خیال۔ طلسمِ ہفت پیکر۔ قصّہ حاتم طائی۔ یا چہار درویش ہو سکتی ہیں۔ لیکن پندرھویں سولھویں صدی عیسوی میں یونانی و لاطینی یعنی کلاسیکی ادب کا احیاءِ ثانی ہُوا۔ یہ کلاسیکی ادب طرزِ بیان میں متناسب اور خیالات میں زیادہ معقول تھا۔ لہٰذا سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں رومانی سے مراد دُور دراز کی عجیب و غریب داستان ہو گیا جو ناممکن الوقوع ہو۔ مبالغہ آمیز اور دقّت طلب ہو۔ زمانۂ وسطیٰ یورپ میں عیسائی جوش و تعصّب کا زمانہ تھا اور اس تعصّب کو کلاسیکی ادب کے احیاءِ ثانی سے نقصان ضرور پہنچا۔

اٹھارھویں صدی کے آخر اور اُنیسویں صدی کے شروع میں یورپ کے مزاج میں پھر انقلاب ہُوا۔ جس سے ادب میں قرونِ وسطیٰ کے زمانے کی خصوصیّات کا دوبارہ احیاء ہُوا۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن ہائن ادب میں رومانی انقلاب کو عیسےٰؑ کے خون سے سینچا ہُوا سُرخ پھول کہتا ہے۔ کیونکہ اس انقلاب نے قرونِ وسطیٰ کا مذہبی پسِ منظر خیال و فن کی دُنیا میں پھر زندہ کر دیا۔

مغربی نقادوں نے رومانی زبانوں کے قرونِ وسطیٰ کے ادب اور جدید ادب کو جو اس ادب کی اصلی یا مفروضہ خصوصیّات کو ادا کرنے کی نیّت سے لکھا گیا "رومانی" ادب قرار دیا ہے اور قدیم یونانی اور لاطینی ادب کو اور اس ادب کو جو قدیم یونانی و لاطینی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادب کی اصلی یا مفروضہ خصوصیات کو ادا کرنے کی نیت سے لکھا گیا "کلاسیکی" ادب قرار دیا ہے۔

ان نقادوں کے مطابق قدیم یونانی و لاطینی ادب میں صفائی۔ سادگی، ضبط اور تناسب اجزا ہے اور جس ادب میں اعلیٰ سادگی، سنجیدگی اور ساخت کی خوبی ہے وہ کلاسیکی ادب ہے۔ ان نقادوں کے نزدیک قرونِ وسطیٰ کے رومانی فن میں مکلّف زیبائش، رنگینی اور فراوانیٔ جذبات کے ساتھ تناسب کی کمزوری بھی وابستہ ہے۔ کیونکہ رومانی ادب میں جوش اور آزادی کے عناصر ہوتے ہیں۔

فرانسیسی نقاد سٹاندال[1] رومان کو ترقی، آزادی اور جدّت کے مترادف سمجھتا ہے اور قدامت اور سند جوئی کو کلاسیکی ادب کا خاصہ۔ پیٹر[2] کے نزدیک کلاسیکی ادب میں مانوس حُسن اور مکمل تناسب کی خوبصورتی ہوتی ہے اور رومانی فن میں ندرت اور تجسّسِ حُسن۔ تصوّر مؤخرالذکر خصوصیّات کو قرونِ وسطیٰ میں دیکھتا ہے۔ پیٹر کے نزدیک یونانیوں اور لاطینیوں میں رومانی اور قرونِ وسطیٰ میں کلاسیکی خصوصیّات پائی جاتی ہیں اور کبھی یہ دونوں خصوصیّات ایک ہی شاعر کے کلام میں موجود ہوتی ہیں۔ پروفیسر ابرکرامبی[3] کا خیال بھی یہی ہے۔ ان کے نزدیک رومان روحانی تجربہ کا بیان ہے۔ ڈائسن اور بٹ کے مطابق تمام ادب ہی رومانی اور کلاسیکی ہے۔ تجربہ کی انفرادیت رومانی خاصہ ہے اور اس کا خوبصورت اور متناسب اظہار کلاسیکی صفت ہے۔ پروفیسر کر[4] کو اعتراض ہے کہ حُسنِ بیان کو کلاسیکی خصوصیّت کیسے کہا جاسکتا ہے۔ جبکہ رومانی شاعر دلدادۂ حُسن ہوتا ہے۔

---

۱ STANDHAL ۲ WALTER PATER

۳ LESEDLLES ABERCROMBIE ROWANTICOSM

۴ KER

بٹرفلیڈ[1] کے نزدیک رومان ایک آہ ہے، ان چیزوں کے لیے جو جا کے نہیں آتیں۔ وہ حسین چیزیں جنہیں وقت برباد کر دیتا ہے ہم انہیں رومانی الم سے یاد کرتے ہیں۔ غروبِ آفتاب کے گذرے ہوئے نظارے۔ پچھلے سال کی برفیں۔ مٹتے ہوئے عقیدے۔ بچپن کا زمانہ۔ اس تعریف کے مطابق اسلامی روایات کی محبّت۔ اسلامی عظمت و شوکت کی یاد اور ماضیٔ اسلام کے احیاء کی کوشش رومانی تحریک ہے اور اقبال ہمارا بہترین رومانی شاعر۔ انیس و دبیر کے مرثیوں میں بھی رومانی عناصر ہیں اور فردوسی کے شاہنامے میں ایران کی گزشتہ تاریخ پر رومانی الم۔ لیکن مندرجہ بالا بحث سے یہ بھی واضح ہوگیا ہوگا کہ ہماری غزل میں رومانی کلاسیکی دونوں صفات اپنے اعلیٰ ترین حُسن میں پائی جاتی ہیں۔ ندرت۔ انفرادیت۔ فراوانیٔ جذبات اور جستجوئے حُسن کے ساتھ ساتھ کہیں سادگی ہے تو کہیں رنگینی۔ کہیں سنجیدگی ہے تو کہیں جوش۔ قدامتِ بیان اور جدّتِ معانی کا امتزاج ہے۔ الفاظ کی موزوں بندش کے ساتھ ترتیبِ معانی کی آزادیٔ تخیّل و بیان کی مترنّم روانی ایشیائی غزل کی طرزِ مانوس میں موجود ہے۔

پروفیسر وان[2] کے مطابق انگریزی ادب میں اٹھارھویں صدی کے مفروضہ کلاسیکی ادب کی تنقید تخلیق میں بدل گئی۔ بذلہ سنجی جذبات میں۔ ہجو اور اخلاق آموزی جوشِ آرزو میں۔ ایشیائی غزل میں یہ دونوں پہلو ہی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل فنِ ادب میں اعجاز کا مرتبہ رکھتی ہے اور انسانی رُوح کی پیچیدہ ترین کیفیات کی حسین آئینہ دار ہے۔

ظاہر ہے کہ لفظ رومان یورپ کی ادبی تاریخ و تنقید کی پیداوار ہے اور ایشیائی ادب پر اس لفظ کو مسلّط کرنا تنقیدی غلطی ہے۔ لیکن سعیٔ تصوّر سے اگر اسے مشرقی ادب میں تنقیدی اصطلاح بھی بنالیا ہے تو ہمارے "نئے ادب" نے

---

۱ BUTTERFIELD ۲ VAUGHAN

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کو فحاشی اور عریانی پر کیسے محدود کر دیا۔ اس لفظ کا یہ استعمال تو یورپی تنقید میں بھی غلط اور باعثِ پریشانی ہوگا لیکن ہمارے ہر فحش نویس اور عریاں نگار کو اس بات کی تسکین ہے کہ وہ رومانی فنکار ہے۔ اور یہ اس قسم کی تہذیبی غلامی اور غلط تشریح کی مثال ہے جس میں حکّام کی اصلی مگر بے سود صفات نہیں بلکہ مضرت رساں فرضی و خیالی صفات کی نقل محض کم علمی کی بناء پر ترقی کے خیال سے کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے "نئے ادب" کے متعلق اس مختصر تنقیدی بحث کو ان مقالات میں شامل کر لینا مناسب سمجھا ورنہ اُردو میں آزاد و بے قافیہ نظم لکھنا اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہیں ہے۔

ان مقالات سے میرا مقصد فقط اسلامی روایات کے متعلق خود آگاہی کو بیدار کرنا ہے۔ اگر ان مقالات سے کسی حد تک کسی صاحبِ فکر کی توجہ اس پس پُشت ڈالے ہوئے مضمون کی جانب منعطف ہو گئی تو یہ مقالات اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ ورنہ کسی پہلوئے حیات پر مکمل خود آگاہی تو کسی انسان کے لیے بھی ممکن نہیں۔

تاریخ عالم میں اسلامی روایات کا اہم حصّہ ہے۔ یہ باعث افسوس ہوگا۔ اگر ہم خود ہی ان روایات کو برباد کر کے ایسے نتائج کی امید رکھیں جن کے لیے دوسرے ذرائع استعمال کرنے ضروری ہیں۔ تاج محل آگرہ کو گرا کر اگر ویسٹ منسٹر کے گرجے کی صورت میں دوبارہ بنا دیا جائے تو اس سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کے امکانات بڑھ نہیں سکتے۔ نہ ہی ہم اس طرح برطانیہ کی موجودہ سیاسی عظمت کے حصّہ دار ہو سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہوگا کہ ہمارے پاس بھی حکمرانوں کی طرح ایک ویسٹ منسٹر گرجا ہوگا جو نقل ہونے کی وجہ سے اصلی گرجے کے مقابلے میں نہایت ہی ادنےٰ تاریخی وقار رکھے گا۔ خواہ اُتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ یہی مثال اپنی روایاتِ تہذیب کو مغربی روایات میں بدلنے پر صادق آتی ہے۔

عناصرِ قوّت (مقالہ اوّل) کا حصول فقط عناصرِ قوّت کے حصول کی منظم کوشش

سے ہی ممکن ہے۔ جو قوّت دوسری اقوام نے نسلوں کی کوشش سے حاصل کی ہے وہ ہم بھی عناصرِ قوت کو سمجھ کر ان کے حصول کے لیے درست عمل کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں۔ محض تہذیبی معاملات میں احساس کمتری۔ تلخیٔ ہمّت اور سختیٔ عمل کا بدل نہیں ہو سکتا۔

مسافرتِ حیات میں اسلام پہ وہ منزل آگئی ہے کہ ماحول تاریک ہو گیا ہے۔ اس تاریکی میں حریفوں کی آوازیں آتی ہیں کہ ہم اپنی راہ چھوڑ دیں۔ کئی کمزور بھائی گھبرا کر راستہ چھوڑ دینے پہ آمادہ ہو جاتے ہیں۔ درست راہ پر چلنے والوں کو بھی اندھیرے میں اپنے راستہ کی درستی پر شک ہو جاتا ہے۔ یہ تقاضائے انسانیت ہے۔ یہ وقت راسخ الاعتقادی، کوشش اور دعا کا وقت ہوتا ہے۔ ہم درست عمل کی روشن مشعل سے ہی درست راستے پر قائم رہ سکتے ہیں۔ خدا کرے کہ جب موجودہ تاریکیاں دُور ہو جائیں اور جب ہماری امیدوں کی دُنیا پر کامیابی کی سحر ضوفشاں ہو تو ہم اس راستے سے ایک شمّہ بھر بھی نہ ہٹے ہوں جس پر صدیوں پہلے حضورؐ سرورِ کائنات نے چلایا تھا۔ آمین! ثم آمین!

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پرمشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ۱

مغرب میں عورت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری "آزادی پسند" خواتین اور "آزادیٔ نسواں" کے حمایتی حضرات کا خیال ہے کہ یہ محض مسلم معاشرے کی تنگ نظری اور روایت پرستی ہے کہ ہماری عورتیں پردہ اور دوسری "معاشرتی قیود" میں بندھی ہوئی ہیں۔ ان کی نگاہ میں مغربی معاشرہ کو عورت کی آزادی نے بالکل فردوس بنا دیا ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ ہمیں مغرب کو مثالی معاشرہ سمجھ کر اپنے معاشرہ کی بنیادی اصلاح کرنی چاہیئے۔ عورت کے لیے شرم و حیا کا اظہار، پردہ، حُسن و زینت کو چھپانا ایسی ذِلّتیں ہیں جنہیں مغرب کی آزاد فضا برداشت نہیں کر سکتی۔ ہمیں بھی مشرقی تاریکیوں سے نکل کر مغرب کی روشنی کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے۔

مغربی ادب میں یہ تکلّف سمجھیئے یا راست گوئی، ہر مرد عورتوں کو ناقابلِ اعتماد جنس خیال کرتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک عورت گھٹیا قسم کا مرد ہے۔ ورجل عورت کو بدل جانے والی جنس سمجھتا ہے۔ شیکسپیئر کے نزدیک اخلاقی کمزوری کا نام عورت ہے۔ ملٹن عورت کو "حسین عیب" کہتا ہے۔ پوپ کے نزدیک عورت دِل میں ہمیشہ آوارہ رہتی ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں زرعی تہذیب کا زمانہ تھا اور کام کھیتوں اور گھر میں ہوتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھوٹی بستیوں میں عورت کی نگہداری ممکن تھی۔ مگر سترھویں صدی یورپ میں سائنس کی ترقی کی صدی تھی۔ اٹھارھویں صدی میں سائنس سرعت سے عملی صورت اختیار کر رہا تھا۔ اس صدی کے آخری نصف سے انگلستان اور یورپ میں "صنعتی انقلاب" کا دور شروع ہوتا ہے۔ اب منڈیوں کی تلاش میں یورپ کرۂ ارضی کی قیصریت کے حصول کی اوّلین منازل پر تھا۔

بہتر اور جلد حاصل ہوتے والے روزگار کی خواہش مردوں کے علاوہ عورتوں اور بچّوں کو بھی گھروں سے نکال کر کارخانوں میں لے آئی۔ اس طرح گھر اور خاندان جو قرونِ وسطیٰ میں سکون اور محبّت کی پناہ گاہیں تھیں ٹوٹ گئے۔ کارخانوں میں اجرت کی حیثیت انفرادی تھی۔ گھر والے دن بھر ایک دوسرے کی آنکھوں سے دور اور اوجھل ہو گئے۔ بچے ماں کی توجہ اور تربیت سے محروم ہو کر یا مر گئے یا غیر مہذّب نفری بن گئے صنعتی انقلاب نے لاکھوں عورتوں کو بے تعلق مزدور اور غیر شادی شدہ مائیں بنا دیا۔ عورتیں اور بچے ظالم سرمایہ داروں کے لیے دراز اور غیر متعیّن دن کی ناکافی اجرت پا کر لاکھوں کی تعداد میں موت کی سیہ آغوش میں پناہ پاتے تھے۔ غرض صنعتی انقلاب نے مغرب میں گھر توڑ دیا جو صرف والدین کی باہمی محبّت اور بچّوں کی تربیت سے قائم رہ سکتا تھا۔ مغرب میں گھر پھر کبھی نہ بن سکا۔

یورپ میں مشینی صنعت کی وجہ سے سرمایہ داری کے نظام نے زرعی نظام کی جگہ لے لی۔ وہ سکونِ قلب جو پہلے زرعی آبادی کو حاصل تھا سرمایہ داری کے نظام میں صنعتی مزدوروں کو حاصل نہ ہو سکا۔ بڑھتی ہوئی صنعتی پیداوار اور وسعت پذیر قیصریت کے باعث سرمایہ دار طبقہ کی دولت میں اندھا دھند اضافہ ہو رہا تھا اور مزدور اور سرمایہ دار کا فرق دن بدن بڑھتا جاتا تھا۔

لیکن اب آزادی اور برابری کے نعرے پیرس میں بلند ہوئے۔ فرانس کے انقلاب

نے خون کے مول قانونی مساوات کا حق خرید لیا۔ انگلستان میں حکومت اور سرمایہ داری کے گٹھ جوڑ نے ایک آدمی ایک ووٹ کی قندیل لپٹی ہوئی افیون بانٹ دی۔ مزدور سیاسی خانہ جنگی اور ہنگامہ خیزی میں مصروف ہو گئے۔ سلوگن بازی سے نیم پختہ خیالات مسلمہ تہذیب کی شکل اختیار کر گئے۔ مثلاً انسانی برابری، انفرادی آزادی، اکثریت کی رائے کا قانون زندگی اور ضمیر کے لیے مسلمہ معیار ہونا وغیرہ وغیرہ۔ مذہب، انصاف، اخلاق، روایت، محبّت، خدمت اب اس تجارتی دُنیا میں ایک بدیشی لعنت بن گئے۔ یہ خیال نہ رہا کہ آزادی میں برابری قائم نہیں رہ سکتی اور جب صنعتی اور فرانسیسی انقلابوں کی ہم عنانی سے اشتراکیت پیدا ہوئی تو اقتصادی برابری کی کوشش نے انفرادی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔

صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں عورت گھر کا محفوظ ماحول اور گھر کی دلچسپیاں کھو چکی۔ اسے شادی اور بچّہ زائیدگی جو اس کی فطرت کے تقاضے تھے، غلامی معلوم ہونے لگے۔ اس طرح عورت خود اپنی نسوانیت کی دشمن ہو گئی۔ مرد کو رقیب سمجھنے سے عورت بحیثیت عورت کے مرد سے محبّت کرنے یا مرد کے دل میں دائمی اور والہانہ محبّت پیدا کرنے کے قابل نہ رہی۔ اس کے لیے مکمل خود سپردگی جو جنسی تسکین کی تکمیل کے لیے ضروری تھی ناممکن ہو گئی۔ وہ پہلے مرد کا گھر، اُس کی پناہ گاہ، اس کا فردوس تھی۔ وہ گھر جس کے لیے مرد مشقت کو خوشی سمجھتا تھا، عورت کی مشفقانہ خود فراموشی مرد کے دل میں محبّت کے نازک دُکھ کی ضامن تھی۔ اب صنعتی انقلاب نے عورت کو بدل دیا تھا۔ گھر ہستی محبّت کی موسیقی نئے مقاصد کی جھنکار میں ڈوب گئی تھی۔ انقلاب سے رنگین ماحول میں ہیجان انگیز نعرے انسانی روح کو شعلہ زار بنا رہے تھے۔ مرد اپنے ماضی کے خلاف بغاوت میں مصروف تھا۔ عورت نے اس مصروفیت سے فائدہ اُٹھا کر مرد کے استبداد کے خلاف بغاوت اور مرد سے برابری کا انقلابی علم بلند کر دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صنعتی انقلاب سے گھر کی جنت اُجڑ جانے پہ بجائے اس کے کہ عورت کی تعمیری فطرت بیوگی کے بین کرتی، مغربی عورت نے فرانسیسی انقلاب سے پیدا شدہ انتشار کے ماحول میں "آزادی" کے لفظ کی دِل کشی کے پردے کے پیچھے، مکمل جنسی غیر ذمہ داری کے حصول کی کوشش شروع کر دی۔ انگلستان میں یہ بغاوت میری وولسٹن کرافٹ کی عورتوں کے حقوق کے متعلق لکھی ہوئی کتاب[1] سے شروع ہوتی ہے۔ مصنفہ کے خیال میں عورت مرد کے بالکل برابر ہے۔ مرد پیار سے عورت کو کھلونا بنا لیتا ہے۔ محبت محض عارضی جذبہ ہے۔ انگلستان میں میری وولسٹن کرافٹ اور فرانس میں ناول نویس جارج ساں[2] اور نسوانی آزادی کے مرد حمایتی صریحاً یا ایمائی طور پہ آزادی کے نام سے بے ضبط جنسی اختلاط کو سراہتے رہے۔ جارج ساں لکھتی ہیں :-

"میرا یہ مستقل اعتقاد ہے کہ شادی ایک نہایت قابلِ نفرین دستور ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ جب نسلِ انسانی انصاف اور معقولیت کی جانب اور ترقی کرے گی تو شادی کی رسم ختم ہو جائے گی۔"

اس نئے انقلاب کو یورپ اور امریکہ کے "جنسی انقلاب" کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔ وقت گذرنے پر اس جنسی انقلاب کے ہمدرد مرد اور عورتوں کی ذہنی کیفیات بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔

امریکہ میں عورتوں کے حقوق کی کنونشن جو ۱۸۴۸ء میں سینیکا فالز (SENECA FALLS) کے مقام پر نیویارک میں منعقد ہوئی۔ اُس کی پاس کردہ قراردادوں میں عورتوں نے اُسی انقلابی شان کی نقل کی جو مردوں کے انگلستان کی قیصریت کے خلاف امریکی

[1] MARY WOLLSTONECRAFT (1759 - 1798) :
A VINDICATION OF THE RIGHTS OF WOMEN (1792)

[2] GEORGE SAND (1804 - 1876)

بغاوت کے اعلانِ آزادی میں ظاہر ہوتی ہے :-

"ہمارا یقین ہے کہ یہ صداقتیں خود ہی واضح ہیں کہ تمام مردوں اور عورتوں کو برابر تخلیق کیا گیا ہے اور خالق نے ان دونوں کو ناقابلِ انتقال حقوق تفویض فرمائے ہیں۔"

"انسانی تاریخ مردوں کے عورتوں کے خلاف مسلسل ظلم اور غصبِ حقوق کی داستان ہے جن کا واحد مقصد عورت پر مرد کا استبداد مسلّط کرنا ہے۔ جس کے ثبوت کے لیے ہم وسیع القلب دُنیا کے سامنے سچّے واقعات پیش کر رہی ہیں[1]۔"

نسوانی حقوق کے اس تاریخی ڈیکلریشن میں مرد اور عورت کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ اخلاقی اور مجلسی قوانین کی بے انصافی کا بھی ذکر تھا یعنی عورتوں نے "ڈبل سٹینڈرڈ" کے خلاف پُر زور احتجاج کیا تھا۔ مردوں کی گنہ گاری کو معافی کی نگہ سے دیکھنا اور عورت کو اسی قسم کی جنسی بدکرداری کے لیے معاف نہ کرنا انتہائی ظلم اور بے رحمی کی دلیل ہے۔ بقول لنڈبرگ اور فارنہم "ڈبل سٹینڈرڈ کے خلاف احتجاج میں عورتیں "اپنی بدکرداری کی خواہش کا اظہار کرتی ہیں" اور ایسے آوارہ اور تماش بین مردوں پر حسد کرتی ہیں، جیسے لارڈ بائرن کے ہیرو ہیں۔

عام مرد کشمکشِ حیات میں اتنا مصروف ہے کہ مردوں کی اکثریت کو عیاشی اور تماش بینی پر ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ملتا۔ اسی لیے مرد چاہتا ہے کہ اس کی زندگی کا جنسی پہلو مستقل شادی سے آسان ہو جائے اور اس کی بیوی اس کشمکشِ حیات میں اس کی ہمدرد اور مددگار رہو۔ مگر عورتیں اُس مرد کی آزادی پر حسد کرتی ہیں

[1] FERDINAND LUNDBERG & MARIAN FARNHAM } MODERN WOMEN

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو بدکرداری پر آمادہ رہتا ہے اور جس کی خود مردوں میں کوئی عزت نہیں۔

لنڈبرگ اور فارنہم کی رائے میں عورت ایسے فرضی مرد پر حسد کرتی ہے جو عورت کو ذلیل سمجھتا ہے۔ بکنے والی، اغوا ہونے والی جنس جو جبر کیے جانے پر آمادہ رہتی ہے۔ یعنی جو مرد بدمعاشی میں، شراب خوری میں، عورت کو ذلیل کرنے میں گذارتا ہے۔ وہ بائرن کے ہیروؤں جیسا مرد عورتوں کے لیے قابل حسد ہے۔

مشرق میں بھی پردہ کے مخالف یہ کہتے ہیں کہ عورت کو پردہ کرانا اور مرد کو لیے پردہ رکھنا ڈبل سٹینڈرڈ ہے۔ اگر آزاد جنسی اختلاط سے پرہیز منظور ہے تو مرد ہی کیوں پردہ نہ کرے۔

اوّل عورت کی صورت کی کشش اور اپنی جارحانہ فطرت کی وجہ سے مرد ہی اس معاملے میں پیش دستی کرتا ہے۔ عورت کے بے پردہ حسن کی کشش قائم رہتے ہوئے عورت محفوظ نہیں رہ سکتی۔

دوسرے۔ ایسے کام جن میں جسمانی مشقت، سریع حرکات، فوجی قسم کے فرائض یا اعلیٰ ذمہ داریاں ہوتی ہیں عورتوں کو نہیں دیئے جاتے۔

تیسرے۔ عام طور پر عورتوں کے کام گھر سے متعلق ہوتے ہیں۔ نیز ماہواری، حمل، بچّوں کی پرورش اور تربیت وغیرہ کی وجہ سے بھی عورت کے لیے وقت گھر پر گذارنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ اس لیے پردہ کی عورت کو کبھی کبھی صرف گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت ہوگی۔ مرد کے کام دوسری نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس لیے دونوں میں سے عورت کے لیے پردہ زیادہ مناسب اور قابلِ عمل ہے۔

چوتھے۔ پردہ ایک مجلسی بندش ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اولاد کی ولدیت کے متعلق شبہات نہ پیدا ہوں۔ یہ واضح ہے کہ کوئی خاوند مباشرت کے وقت اپنی بیوی کو اپنے تخم کے سوا کسی اور کا تخم دے ہی نہیں سکتا۔ لیکن بیوی اپنے شرعی خاوند

کو کسی دوسرے مرد کا بچّہ خاوند کے خرچ سے پرورش پانے اور خاوند کا وارث بننے کے لیے دے سکتی ہے۔ غرض بچّے کی ولدیت کے متعلق دھوکا مرد کی طرف سے نہیں ہو سکتا، عورت کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف تہذیبوں میں عورتوں پر مجلسی پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ اور اسلام میں بھی یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ عورت پردہ کرے۔

مغرب میں اکثر غیر شادی شدہ ماں اپنے بچّے کے باپ کا نام ظاہر نہیں کرتی۔ وہ کئی مردوں پر شبہ کر سکتی ہے یا کئی مردوں کے سر پر الزام رکھنا چاہتی ہے تاکہ سب ہی دھوکے میں اس کے بچّے کی پرورش میں مدد دیں یا یہ کہ شادی شدہ مرد سے اس کی بیوی کی دوست یا رشتہ دار کی حیثیت سے آشنا ہوئی تھی یا وہ اپنے دوسرے آشناؤں کو بددل نہیں کرنا چاہتی۔ مگر حالات اپنی پیچیدگی میں واضح ہیں اور شادی شدہ عورت کو بھی ایسی سوسائٹی میں اسی قسم کے مواقع مہیا ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں مجلسی پابندیاں عورتوں پر ہی عائد ہوئی ہیں۔

لیکن ڈبل سٹینڈرڈ کا آسان علاج عورتوں کے نزدیک یہی ہے کہ سب مجلسی اور خانگی بندشیں دور ہو جائیں۔ افسوس ہے کہ برابری کی اس کشمکش میں کبھی عورتیں مردوں کی آوارگی کی مذمت نہیں کرتیں، بلکہ اُن کی بدکرداری کو آزادی کا مقدس نام عطا کرتی ہیں۔ اور اس آزادی میں وہ مرد سے برابری چاہتی ہیں۔ اور یہ بھی باعثِ شرم ہے کہ عورتیں کبھی یہ تجویز پیش نہیں کرتیں کہ مردوں کی آوارگی کو قانونی جرم قرار دیا جائے۔ نہ یہ تجویز پیش کرتی ہیں کہ بدکرداری ثابت ہونے پر طرفین کو مناسب سزاؤں کا مستوجب سمجھا جائے۔

عورتوں کے حقوق کی کنونشن جو دوسٹر، میساچوسٹس امریکہ میں ۱۸۵۰ء میں منعقد ہوئی، اس میں مس ایبے برائس نے اپنی تقریر میں اس امر پر زور دیا کہ عورتوں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ملازمتیں ملنی چاہئیں تاکہ وہ شادی کی ضرورت سے آزاد ہو جائیں۔"

نیویارک ٹریبیون اخبار میں ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو مسز الزبیتھ سٹانٹن نے لکھا کہ "شادی عورت کو ذلیل کرتی ہے۔"

الزبیتھ کیمبل اپنی کتاب "ایوولیوشن آف وومن" میں لکھتی ہیں کہ "شادی نے عورتوں کو جنسی غلام بنا دیا ہے۔"

جان سٹوارٹ مل[1] انگریزی فلسفی کے نزدیک شادی ایک ایسی غلامی ہے جو ہمارے (انگلستانی) قانون کے تحت جائز سمجھی جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل چند اقتباسات لنڈبرگ اور فارنہم (ماڈرن وومن) سے لیے ہوئے ہیں اور "آزادی" اور مرد سے "برابری" کے درست معانی کو واضح کرتے ہیں:۔

"ہم عیسائی مذہب کی اٹوٹ شادی کے خلاف ہیں۔ طلاق کی موجودہ زیادتی تسکین دہ ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں۔ نسوانی تحریک کا آخری مقصد شادی کو ختم کرنا اور آزاد جنسی تعلقات کا قیام ہے۔ عورت اسی طرح اپنی شخصیت کی نشوونما کر سکتی ہے۔"

ڈبلیو۔ آئی۔ جارج
اٹلانٹک منتھلی ۱۹۱۳ء

"مرد اور عورت کے غیر منظم جنسی تعلقات کو ہم بدکرداری نہیں سمجھتے۔"

چارلٹ گلیمین

"فطرت کے تقاضوں کے تحت عورت اور مرد محبت کرنے میں آزاد ہونے چاہئیں محبت کے پر ہوتے ہیں اور وہ اُڑ جاتی ہے۔ جب محبت نہ رہے تو عورت اور مرد کا اکٹھے نظر آنا اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔ البتہ بچوں کے لیے اگر وہ چاہیں تو یہ

[1] JOHN STUART MILL (1806-1873) : ON THE SUBJECTION OF WOMEN (1869)

حیثیت قائم رکھ سکتے ہیں۔ ان حالات میں دونوں کو آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ آپس میں سمجھوتہ کر کے کہیں اور جہاں چاہیں محبت کر لیں۔"

جین اولکاٹ
سیکرٹری نیویارک سٹیٹ سفریج ایسوسی ایشن
شائع کردہ نیویارک ٹائمز ۱۵ مئی ۱۹۱۴ء۔

"موجودہ جنسی بغاوت اس قسم کی عورت میں نظر آتی ہے جسے ایسی مجلسی تنظیم سے عقیدت ہے، جس میں عورت کی زندگی میں مرد کی کوئی حیثیت نہ ہوگی سوائے اس کے کہ وہ اس کے بچے کا باپ ہے۔"

ڈبلیو۔ ایل۔ جارج
اٹلانٹک منتھلی۔ دسمبر ۱۹۱۳ء

"ہم ایک عورت کے ایک مرد سے جنسی تعلق میں یقین رکھتے ہیں، مگر معقولیت کے ساتھ۔ یعنی ہمیشہ اُسی ایک مرد سے نہیں۔"

ایک عورت کی تقریر سے اقتباس
از فیمنزم۔ مصنفہ مسٹر و مسز جان مارٹن

"محبت میں ہمیشہ آزاد انتخاب کا اختیار۔ یہ ہے عورت کا اصلی ووٹ۔ یہ حیثیت عورت کو دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ موجودہ شادی قبیلے کے سردار کی بطریقی حکومت کے زمانے کی قابلِ نفرین یادگار ہے۔"

سبی۔ گیسکائن ہارٹلے
از۔ دی ٹروتھ اباؤٹ وومن

"جن لوگوں نے کبھی ایک دوسرے کو پہلے نہ دیکھا ہو اور جو ایک دوسرے کو آئندہ دیکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں، ان کے لیے ہمیں ایسی آزادی کی ضرورت ہے جس میں وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پبلک کے قبول کردہ حالات میں بچے پیدا کر سکیں۔"

برنارڈ شا

سوشیولاجیکل پیپرز ۱۹۰۴ء

"میں غیر شادی شدہ اکیلی عورت کو قابلِ عزت سمجھتی ہوں۔ میری یہ پیشین گوئی ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب بلا شادی زندگی گذارنے والے اکیلی عورت شادی شدہ خواتین سے زیادہ قابلِ عزت سمجھی جائے گی۔"

مسز سیلیا برلے

اقتباس از تصنیف جے۔ ایم۔ بکلے

"دی رونگ اینڈ پیرل آف دومن سفریج"

"بہت سی غیر شادی شدہ عورتیں بچوں کے لیے خواہش رکھتی ہیں۔ ان کی مامتا کے اظہار و تسکین کے لیے موقعہ فراہم ہونا چاہیئے۔"

مسز فلورنس وائز

سیکرٹری ویمنز ٹریڈ یونین لیگ آف نیویارک

مطبوعہ نیویارک ٹائمز ۲۵ مئی ۱۹۱۴ء

"میرے خیال میں مستقبل کی جنسی دوستی کا اصل مفہوم خصوصی طور پر محض بچوں کی پیدائش نہ سمجھا جائے گا، بلکہ یہ عورت اور مرد کی قریب ترین دوستی شمار ہوگی۔"

از۔ کارل پیٹرسن

"دی ایتھکس آف فری تھاٹ" ۱۸۸۷ء

لنڈبرگ اور فارنہم کی رائے میں عورتیں تہذیب کو اس گذشتہ فرضی فردوس کی جانب دوبارہ لے جانا چاہتی تھیں جب کہ دولت اور جنسیت سب کی باہمی ملکیت تھیں۔ عورت سے نسب دیکھا جاتا تھا اور حکمران تھی۔ لیکن ڈاکو مرد سازش کر کے

عورتوں کو لوٹ کر لے گئے اور پھر اُن سے خوب زنا بالجبر کیا۔ گو اس فرضی فردوس کی تفصیلات اور نفسیاتی پسِ منظر کو اینتھروپولوجی کے ماہر آج کل تاریخِ عالم پر قابلِ اطلاق نہیں سمجھتے، لیکن بقول لنڈبرگ اور فارنہم "زنا بالجبر کے خیالی خواب، دلی خواہش کی خاکہ آرائی، کا فیمنسٹ لٹریچر میں بڑا اہم کردار ہے۔" غالباً اس لیے کہ عورت اپنی جنسی خواہش کے حصول کے لیے اپنی ذمہ داری تسلیم کرنے سے ہمیشہ گریز کرتی ہے۔

انیسویں صدی کے پچھلے نصف میں عورتوں کے ووٹ حاصل کرنے کی تحریک (SUFFRAGE MOVEMENT) زور پکڑ گئی۔ انگلستان میں پہلی عالمی جنگ کے دوران میں عورتوں نے مردوں کے کئی کام سنبھال لیے۔ ریل کے سگنل دینا۔ مکانوں کی مرمت، رنگ و روغن کرنا، گورکنی وغیرہ۔ ۱۹۱۸ء میں کچھ عورتوں کو ووٹ کا حق دے دیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں یہ حق سب عورتوں کو مل گیا۔ فرانس میں یہ حق دوسری عالمی جنگ کے دوران میں ۱۹۴۴ء میں دیا گیا اور اسی طرح بیسویں صدی کے پہلے نصف میں تمام یورپی ممالک میں عورتوں کو ووٹ کا حق قانونی طور پر مل گیا۔

غرض پہلی عالمی جنگ سے فائدہ اُٹھا کر مجلسی شکست، سیاسی کشمکش اور مذہبی بے یقینی کے ماحول میں عورت نے جنسی بدنظمی کی آزادی بھی حاصل کر لی۔ بقول لنڈبرگ اور فارنہم "ہمارے پاس مواد موجود ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ بڑے صنعتی ممالک میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جرمنی، انگلستان، روس وغیرہ میں پہلی عالمی جنگ کے بعد جنسی خلط ملط کے راستے سے تمام رکاوٹیں ختم ہو گئی تھیں۔"

ڈاکٹر ایل۔ ایم۔ ٹرمین[۱] آٹھ سو عورتوں سے سوال جواب کر کے اس نتیجے پر

---

۱ DR. L.M. TERMAN : PSYCHOLOGICAL FACTORS OF MARITAL UNHAPPINESS.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہنچے کہ وہ عورتیں جن کی شادی ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان ہوئی ان میں سے تقریباً ۶۸ فیصد اپنے بیانات کے مطابق شادی کے وقت باکرہ نہیں تھیں۔ مس بروہلے اور مس برٹن[۱] کے نزدیک کالج کی اکثر لڑکیاں جنسی عمل سے متعارف ہو چکی ہوتی ہیں۔

لنڈبرگ اور فارنہم کے مطابق "شادی شدہ عورتوں میں خاوند کے علاوہ دوسرے مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات کی وجہ سے بیویوں کی بے وفائی بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔"

انگریزی مصنف جارج۔ آر۔ سکاٹ[۲] کے نزدیک کئی عورتیں ضمنی طور پر فاحشہ گری کرتی ہیں۔ "ان شوقین یا غیر پیشہ ور فاحشات کی کثرت آج کل جتنی ہے اتنی کبھی نہ تھی۔ یہ سوسائٹی کے نچلے سے لے کر اوپر کے طبقے تک میں پائی جاتی ہیں۔ اگر ان معزز خواتین کو کہیں اشارے کنائے میں بھی فاحشہ کہہ دیا جائے تو یہ آگ بگولا ہو جائیں گی۔ مگر ان کی ناراضگی سے حقیقت نہیں بدل سکتی"۔[۳] جارج۔ آر۔ سکاٹ کے خیال میں صنفی آوارگی کا اہم سبب یہ ہے کہ عورتیں روز افزوں تعداد میں تجارتی کاروبار، دفتری ملازمتوں اور مختلف پیشوں میں داخل ہو رہی ہیں، جہاں شب و روز انہیں مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔

اس طرح عورت گھر کے استقلال کو ضائع کر کے مرد کی طرح مزدور بن گئی ہے۔ وہ مرد کی دنیا میں نچلے درجے کے کام کرتی ہے۔ جنسی استقلال، بچوں کی محبت،

---

۱ DOROTHY D. BROHLEY & FLORENCE H. BRITTEN } YONTH AND SEX

۲ GEORGE R. SCOTT : A HISTORY OF PROSTITUTION

۳ یہ اقتباس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "پردہ" سے لیا گیا ہے۔ (۱۹۷۰ء)

گھر کے فرائض کی فطری حقیقتوں کو رد کر کے نیم خوابی کی دنیا میں وہ اپنے آپ کو فخریہ مرد کی زندگی گذارتے ہوئے دیکھتی ہے۔ وہ ایک مرد سے دائمی رفاقت میں اپنا جنسی وقار نہیں ڈھونڈتی۔ لیکن وہ اس ناقابلِ اعتبار دنیا میں اپنی متزلزل جنسی حیثیت کو سنبھالنے کے لیے اپنے ہینڈ بیگ میں آئینہ اور لپ سٹک لیے پھرتی ہے۔ وہ اب اسپرین، بروبائیڈ، خواب آور گولیوں، نیم حکیم نفسیات، فرضی زائچوں اور بوگس علم النجوم میں اپنی تسکین جوئی میں مصروف ہے۔ وہ مرد کی خانگی مسرت کی ضامن بن کر مرد کے ساتھ دست بدست چلنے کو تیار نہیں ہے۔ گھر کی پناہ گاہ کے برباد ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی اعتقاد، خدمت کی خوشی اور محبت کی کڑیاں کمزور ہو گئی ہیں۔ عورت کی ملکوتی صفات کو خود غرضی اور احساس تنہائی نے چھپا دیا ہے۔ انانیت، انفرادیت اور سیاسی انقلاب کی نسوانی تفسیر جنسی بدنظمی میں بیان ہوتی ہے۔ مردوں کے کام سنبھالنے سے عورت دماغی طور پر مرد بننے کی کوشش کرتی ہے اور کیونکہ مرد بننا مشکل ہے وہ ایک تیسری عجیب سی جنس معلوم ہوتی ہے۔

نسوانیت کی اس اجتماعی خودکشی سے مردانہ ردِ عمل میں وسیع اور عمیق تغیر پیدا ہو رہا ہے۔ اغلام ہر تہذیب میں ہمیشہ خفیہ عیب اور قانونی جرم قرار دیا جاتا رہا ہے۔ لیکن آج مغربی ممالک میں اغلام قانونی طور پر جائز خوش وقتی سمجھا جاتا ہے۔ مغربی عورت کے مرد بننے کی کوشش کا اس ذہنی، مجلسی اور قانونی تغیر میں کتنا حصہ ہے غور طلب امر ہے۔

مغربی ممالک میں اغلام کی قانونی اجازت بیسویں صدی میں عورت کی آزادی کے ساتھ ساتھ مگر بعد میں ہوئی ہے، جیسے کہ ان دونوں میں علت و معلول کا قریبی تعلق ہو۔ جب عورت کو ووٹ ملے، اقتصادی نظام میں اور جنسیت میں مکمل آزادی حاصل ہو گئی تو وہ بدل گئی۔ وہ جنسی تسکین پوری طرح مہیا کرنے کے قابل نہ رہی۔ عورت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی جمہوری آزادی میں خاوند کی بجائے بہت سے مرد ڈھونڈتی ہے۔ وہ کسی مرد کو بھی سنبھال نہ سکی اور اس طرح طلاق اور اغلام کو فروغ دیا۔

گھر اور بچّوں کی محبت سے، عشق اور اخلاقیات سے آزاد عورت، اپنی فطری حیا اور سپردگی کی دشمن عورت، مرد کو مناسب تسکین مہیا نہ کر سکی۔ وہ ایک مشترک گھر میں ایک مرد کی اولاد کو پیدا کر کے اس اولاد کی تربیت کی ذمہ داری سنبھالنے کو تیار نہیں ہے۔ وہ زندگی کی راہ پر ایک مرد کے دوش بدوش چلنے کو تیار نہیں ہے۔

آزاد عورت کی انا اس کا ذہنی مرکز بن جاتی ہے ——— مرد عورت کی بجائے ایک رقیب سے دوچار ہوتا ہے۔ مرد کی وفا اور پرستش حاصل کرنے کی مسرّت ایسی عورتوں کی قسمت میں نہیں ہوتی۔ مرد وقتی خوشامد کرتے ہیں پھر دغا دے جاتے ہیں۔ مکمل جنسی تسکین "مفت کا لطف" سے بہت ارفع چیز ہے۔ آپ جو دیتے ہیں وہی لیتے ہیں۔ عورت اپنے آپ کو دھوکے میں گراتی ہے۔ پھر دغا دے جاتی ہے۔ یورپ کی آزاد جنسیت اصل جنسی تسکین میں بہت نادار ہے۔ عورت کی انا نے خود فرضی مرد بننے کی کوشش سے یورپ کے مرد کو اغلام کی طرف دھکیل دیا ہے۔ یہ وہ مغربی فردوس ہے جہاں مشرق کے لوگ جنسی آزادی کی وجہ سے معاشرتی کاملیت کا ارفع ترین مرقع دیکھتے ہیں یا دیکھنا چاہتے ہیں۔

عورتوں کے ایک ہفت روزہ پاکستانی اخبار میں یہ خط چھپا ہے :-

گرل فرینڈ شریف نہیں ہوتیں

"پروین انیس صاحبہ کا خط پڑھا، جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ :-
گرل فرینڈ شریف نہیں ہوتیں۔ میں ان سے صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ یہ بات کیا وثوق سے کہہ سکتی ہیں ؟ دنیا میں کسی کے متعلق کچھ نہیں کہا

جا سکتا۔ مرد اور عورت کے باہمی میل جول سے شرافت ختم نہیں ہو جاتی جب عورت مرد کے ساتھ مل جل کر کام کرے گی تو یہ بے جا حجاب اور ہیجان ختم ہو جائے گا۔ مغربی اقوام کو ہی لیجئے۔ یہاں (مغرب) کی عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں اور اپنے ذہنوں کو پست خیالات سے دور رکھتی ہیں۔ آپ سے گذارش ہے کہ ایسی باتوں پر بحث کرنا چھوڑ دیں اور اپنے ذہن کو اُن کاموں کی طرف مائل کریں جن سے روشنی ملے اور تاریکی دور ہو جائے۔"

ب۔ ن سٹیلائٹ ٹاؤن
سرگودھا

مغرب کے فاضل فلسفی یاں پال سارتر کے ناول 'THE AGE OF REASON' کے ایک کردار بورس کے نزدیک "گرل فرینڈ" کے انتخاب میں نکتہ ہی کیا ہے۔ یہ ہر ایک کے لیے ایک ہی بات ہے۔ یہ جسمانی تقاضا ہے۔" اس نے پھر سخت کراہت سے دُہرایا:- "جسمانی !"

ظاہر ہے کہ مشرق کی روشن ضمیر عورت دھوکے میں ہے۔ مگر دھوکا خواہ لاعلمی سے ہو یا عمداً عمل کو مکافات سے نہیں بچا سکتا۔ ظاہر ہے کہ مغربی عورت کے تتبع کرنے سے مشرقی عورت مشرق میں بھی مغربی حالات پیدا کر رہی ہے۔

کئی ترقی پسند حضرات اور خواتین کا خیال ہے کہ مغربی خاوند بیوی کو سب مردوں سے ملنے کی کھلی آزادی دیتے ہیں۔ مغربی خاوند حاسد خاوند نہیں ہوتے۔ ممکن ہے، یہ ان کا شعوری رویہ ہو۔ کیونکہ آزاد جنسیت کے ماحول میں حاسدانہ گفتگو معقولیت کے خلاف اور بے محل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن معاشرہ کے تقاضے بنیادی فطرت کو شعوری ضبط سے صرف چھپا سکتے ہیں بدل نہیں سکتے۔ شعوری ضبط کے کمزور ہونے پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب فطرت کو موقع ملتا ہے تو ذہن کے بنیادی حقائق ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ایسے مواقع شراب خوری مہیا کرتی ہے۔ جب شراب شعور کا ڈھکنا ہلا دیتی ہے تو دل دبے ہوئے دُکھوں کی بھڑاس نکالتا ہے۔

ڈاکٹر کیسل اور ڈاکٹر والٹن[1] لکھتے ہیں کہ شراب کا پہلا اثر خاوند پر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے متعلق حاسدانہ خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ جذبہ شعوری حسد سے بہت زیادہ تُند ہوتا ہے۔ شراب خور خاوند اپنی بیوی کے متعلق شکوک کا اظہار کرتا ہے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس نگہ سے اپنی بیوی کی ہر حرکت کو دیکھتا ہے۔ کئی حالات میں بیوی کی فریب کاری اور بے وفائی کا یقین خاوند کے ذہن پر مکمل طور پر حاوی نظر آتا ہے۔ بیوی کے اتفاقیہ فقرے اور بیوی کی جانب دوسرے مردوں کی نگاہیں اس کے شبہات بھڑکاتے ہیں۔ وہ بیوی کے ہینڈ بیگ میں عشقیہ خطوط تلاش کرتا ہے اور اس کے لباس میں اس کی بدکرداری کے واضح ثبوت ڈھونڈتا ہے۔ کبھی بیوی کو زانیہ اور فاحشہ سمجھ کر اسے گالیاں دیتا ہے اور زدوکوب کرتا ہے۔ لیکن یہی خاوند دوسرے معاملات پر اس معقولیت سے گفتگو کرتا ہے کہ ڈاکٹر اسے زبردستی ہسپتال میں نہیں روک سکتے۔ اور بیوی سے علیحدہ کرنے پر اس کا حسد اور بھڑکتا ہے۔ فاضل ڈاکٹروں کیسل اور والٹن کے مطابق طلاق یا بیوی کا قتل ان حالات کا انجام ہو سکتے ہیں۔ فاضل ڈاکٹروں کے اس تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالات مختلف سہی مگر جذبات کے معاملوں میں انسانوں کے فطری میلان مغرب و مشرق میں بنیادی طور پر ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیویوں کے کردار کی جلن ہی مغرب میں اکثر خاوندوں کو عادی شراب خور بنا دیتی ہے۔

---

[1] DR. NEIL KESSEL & DR. HENRY WALTON } ALCOHOLISM (1965)

جے۔ او۔ ہیئر[1] لکھتی ہیں: "تمام معاشرے نے اخلاقی معلامات میں سزا اور جزا سے آزادی دے کر بدی کے راستے کو اور ہموار کر دیا ہے، جیسے فلموں، پریس، لباس اور جنسی کشش کی طرف توجہ دلانے والی تجارتی فرموں نے اور زیادہ دل کش بنا دیا ہے۔"

بقول لارڈ سٹونہیم اگرچہ لوگ پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعے نیک اخلاق والے بنائے نہیں جا سکتے۔ پھر بھی قوانین سوسائٹی کے اخلاقی معیار اور اخلاقی چال چلن کی حدود واضح کرتے ہیں۔

لارڈ ڈیولن[2] کے خیال میں قانون کو ذاتی چال چلن کے دائرے میں دخل انداز ہونا چاہیئے۔ اُن کے خیال میں یہ عمل صحت مند معاشرہ بنانے کے لیے ضروری ہے۔

پردہ کم از کم اپنے مقصد سے سوسائٹی کی ذہنی صحت کا اظہار کرتا ہے، جو مقصد سوسائٹی کے لیے قابلِ احترام ہے، اس کے حصول کی کوشش بھی قابلِ ستائش ہے۔ اگر مسلمان مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر متعلقہ قوانین کو اسلامی رنگ دیں تو اس سے مسلمانوں کے اخلاقی معیار کی حدود واضح ہو جائیں گی۔

جمہوری جذبہ موجودہ دُنیا کی سیاست میں باوقار حیثیت رکھتا ہے۔ سوویٹ روس میں حکمران اشتراکی پارٹی کے ممبر انقلاب سے نصف صدی بعد بھی تمام آبادی کا صرف ۱۳ فیصد حصہ ہیں۔ اب یہ پارٹی باقی ۸۷ فیصد آبادی کے اُوپر قانونی طور پر قیصریت کی طاقت رکھتی ہے یعنی ۸۷ فیصد آبادی کی حیثیت محض محکوم رعایا کی سی ہے۔ یہی حال دوسری اشتراکی ریاستوں کا ہے لیکن سب اشتراکی ریاستیں اپنے آپ کو PEOPLES' DEMOCRACIES یعنی عوامی جمہوریتیں کہتی ہیں تاکہ جمہوریت کا سیاسی

---

[1] J.O. HARE : THE ROAD TO PROMISCUITY

[2] DEVLIN P.A. (BARON DEVLIN) : THE ENFORCEMENT OF MORALS

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وقار ان کو حاصل رہے اور یہ بھی ایک قسم کی سیاست ہے۔

اسلامی ریاستوں میں اس جمہوری جذبے کی حدود بندی اخلاقیات سے ہوتی ہے، لیکن اس جمہوری جذبے کو سیاسی وقار کی بناء پر معاشرہ کے غیر سیاسی پہلوؤں پر حاوی کرنا معمولی عقل و دانش کے خلاف ہوگا۔ سیاسی جمہوریت سیاست کے دائرے میں اپنی مناسب جگہ پر ہے لیکن غیر سیاسی دائروں میں سیاسی جمہوریت کے اصولوں کو گھسیڑنا گڑبڑ مچانے کے مترادف ہوگا۔ ماں باپ کا ضبط بچّوں کی حفاظت اور تربیت اور ان کے ممکن ذہنی ارتفاع کے لیے ضروری ہے۔ استاد کا ضبط شاگردوں پر اور مذہب اور اخلاقیات کا ضبط انسانی ضمیر پر تعلیم و تہذیب کے حصول اور ترقی کے لئے ضروری ہیں۔ اگر سیاسی جمہوریت کی نعرہ بازی کو خاندان، تعلیم، مجلسی رکھ رکھاؤ، خدمت، وفاداری کے دائروں میں داخل کر دیا جائے تو معاشرہ بے لگام، پراگندہ اور برباد ہو جائے گا۔ مغرب میں زنا، جنسی امراض، حرامی بچّے، اسقاط الحمل، اغلام، جنسی تجربے، خاندان کی شکست، ماں باپ اور تعلیمی اور تہذیبی ضبط کے خلاف بغاوتیں، یہ سب ایک حد تک سیاسی جمہوریت کے جذبے کے غیر سیاسی دائروں میں بے جا، غلط اور غیر دانشمندانہ استعمال کے نتائج ہیں۔

سیاست عام طور پر انتہائی خود غرضی کا ایسا اجتماعی اظہار ہوتی ہے جو قانون اور انقلاب دونوں شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ سیاست کو مہذّب مجلسی خوبیوں مثلاً سچائی، پاک دامنی، خیرات، رواداری، ادب اور لحاظ، میزبانی، اعتماد، ہمدردی وغیرہ وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مسلمان دانشوروں کے لیے یہ ضروری تھا کہ علم و فکر کی بنیاد پر مغرب کی حالت کا درست اندازہ کرتے۔ قوائے تشریح و تنقید کو استعمال میں لاتے۔ سیاسی جمہوریت کے جذبے کو سیاست کی حدود میں رکھتے اور جمہوریت کے سیاسی جذبے کو اسلامی زندگی

کے غیر سیاسی پہلوؤں میں بد نظمی پھیلانے سے روکتے۔ اب بھی شاید لمحۂ فکر کا موقع ہاتھ سے نکل نہیں گیا۔ بہتر یہی ہے کہ احساسِ کمتری کو اصولِ حیات بنا کر مغرب کی اندھا دُھند نقل نہ کریں، بلکہ علم اور تشریح کی روشنی میں حالات کا درست جائزہ لیں۔ سلوگن بازی اور خیالی آتشبازیوں سے متاثر نہ ہوں اور اسلام کی آئندہ ذمہ داریوں پر نگاہ رکھیں۔ اسلام کو خدمتِ انسانی کے کچھ فرائض ابھی بھی ادا کرنے ہیں۔ حقائق چیخ رہے ہیں۔ ہم کب تک پیٹھ موڑ کر اپنی تقدیر کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جنسی امراض معاشرہ کے جنسی حالات سے متعلق ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یورپ کے جنسی حالات کی نقّالی کے اثرات کا تجزیہ جنسی امراض کے ذکر کے بغیر نامکمل ہوگا۔

سوزاک کا ذکر بائبل کے عہد نامۂ عتیق میں آیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے جنگ کے بعد تمام مدیانی قیدی عورتوں کے قتل کا حکم دیا تاکہ ان کی قوم بیماریوں سے محفوظ رہے۔ یونانی اور رومی طبّی ادب میں اس بیماری کے حالات کا ذکر بالکل صریح طور پر نہیں ملتا۔ انگلستان[1] میں ۱۱۶۱ء میں ایک قانون کے تحت لندن کے قحبہ خانوں میں ایسی عورتوں کے رکھنے کی ممانعت تھی جو پیشاب کی جلن کی مریض ہوں۔ ۱۴۳۰ء میں ایک سرکاری حکم کے تحت لندن کے قحبہ خانوں میں ایسے مردوں کے داخلے کی ممانعت تھی، جنھیں خفیہ جنسی مرض ہو، جس سے مراد سوزاک تھی۔ طبّی سائنس نے ترقی کی تو ۱۸۷۹ء میں سوزاک کے جراثیم (GONOCOCCI) پہچانے گئے۔

۱۴۹۳ء میں کولمبس اور اس کے ساتھیوں نے امریکہ کو دریافت کیا اور وہاں کی عورتوں سے آتشک کے موذی مرض کو پرانی دنیا میں درآمد کیا۔ ۱۴۹۵ء میں یہ مرض وبا کی طرح تمام یورپ میں پھیلا ہوا تھا۔

مشرق میں آتشک واسکوڈے گاما اور اس کے پرتگیزی جہازرانوں کے ذریعے

---

[1] R.S. MORTON: VENEREAL DISEASES

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آئی ۔ ہندوستان میں اسی لیے اسے بادِ فرنگ کہتے تھے ۔ پرتگیزی جہاز رانوں[1] نے یہ بیماری جاپان اور بحرالکاہل کے مغربی ساحلوں کی اقوام میں بھی پھیلا دی ۔

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق جنسی امراض یورپ کے لیے تاکیدی مسئلہ ہیں۔ انگلستان میں ایک قانون[2] کے تحت مقامی انتظامیہ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ خفیہ فری طبی مراکز جنسی بیماریوں کے لیے قائم کرے ۔ ایسے دوسو تیس ہسپتال اب انگلستان میں قائم ہیں ۔ ۱۹۶۲ء میں اس سلسلے میں پونے چھ ملین پونڈ صرف سرکاری خرچ تھا ایسے مریضوں کا خرچ جنھوں نے ذاتی طور پہ پرائیویٹ ڈاکٹروں سے علاج کرایا اس سے بہت زیادہ تھا ۔ انسانی نقصان اور کام کا ہرج اس سے علیحدہ ہے ۔ روس میں اِس قسم کے چھ ہزار ہسپتال قائم ہیں ۔

ڈاکٹر مورٹن کے خیال میں مختلف ملکوں میں آتشک کا کچھ اندازہ اس ملک کی حاملہ عورتوں کے خون کے امتحان سے ہوسکتا ہے ۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے اس پہلو سے کئی سروے کروائے ہیں ۔ پاکستان میں ۲ء۱ فیصد حاملہ عورتیں آتشک زدہ ثابت ہوئیں ۔ مراکو میں ۱۴ سے ۳۰ فیصد تک اور مصر میں ۷ سے ۱۵ فیصد تک ۔

۱۹۶۳ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دو لاکھ ۷۸ ہزار ۲۸۹ سوزاک کے نئے مریض درج کیے گئے ۔ پرانے مریض اور ایسے مریض جو ذاتی علاج کی وجہ سے خفیہ رکھے گئے ان کے علاوہ ہیں ۔

مغرب میں جنسی امراض کی ترقی زیادہ جنسی عمل کا نتیجہ ہے ۔ بقول ڈاکٹر مورٹن "خاص طور پہ لڑکیوں میں" ۔ اغلام والے بھی دونوں طرح ان بیماریوں کے پھیلانے میں حصّہ لیتے ہیں ۔ انگلستان میں مردوں کے ایک تہائی کیس اغلام والوں

---

[1] R.S. MORTON : VENEREAL DISEASES

[2] VENEREAL DISEASES REGULATIONS

کے ہیں ۔ سالانہ ایک لاکھ نئے مریض مرد انگلستان کے دو سو تیس مخصوص ہسپتالوں میں آتے ہیں ۔ عورتیں مردوں سے بہت زیادہ ہوتی ہیں ۔ جو لوگ ہسپتالوں سے باہر علاج کراتے ہیں ان اعداد میں شامل نہیں ۔ بقول ڈاکٹر مورٹن "لاکھوں جنسی امراض کی روگی مگر ظاہراً بے علامت عورتیں جن میں سے کنجریاں[1] صرف ایک تہائی ہیں ، اِن امراض کے جراثیم کا عالمگیر خزانہ بنی ہوئی ہیں ۔"

ڈاکٹر مورٹن کے مطابق امریکہ ، سویڈن ، فن لینڈ وغیرہ میں صورتِ حال یہی ہے ڈنمارک میں ۱۹۶۱ء میں پندرہ سے اُنیس سال کی عمر کی لڑکیاں آتشک کی نئی مریضہ عورتوں میں سے ۴۳ فیصد تھیں ۔ فاضل ڈاکٹر کے خیال میں "جنسی آوارگی اور جنسی بیماریوں کا آغاز تیرہ سے اُنیس سال کی عمر کی لڑکیوں کی بغاوت سے شروع ہوتا ہے" ۔ بچّوں کی بغاوت گھر سے باہر دیر تک ٹھہرنے کی صورت اختیار کرتی ہے ۔ لڑکیوں کے لیے رات بھر گھر سے باہر رہنا اور اُن کی بغاوت کی تکمیل اور اُن کی معاشرتی تذلیل کا آغاز ہے ۔ وہ اب جنسی خلط ملط کی زندگی گذارتی ہیں ۔ اور جنسی بیماریاں حاصل کر کے اُن بیماریوں کے زنانہ ذخیرے بن جاتی ہیں ۔

۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر الزبیتھ کیٹلے[2] نے ہولوے جیل میں تین سو شاسی کنجریوں میں سے ایک سو پینتالیس یعنی ۳۷ فیصد کو پندرہ سے بیس سال کی عمر کا پایا ۔

---

[1] ضمیموں میں اختصار کے لیے "پیشہ ور فاحشہ عورت" کے لیے "کنجری" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔ کنچنی کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کیا گیا کیونکہ "کنچن" ہندوستان میں ایک ذات کا نام ہے ۔ "کنجری" غالباً وہی لفظ بدل کر اصطلاحی لغت بن گیا ہے ۔ بہرحال مطلب واضح ہے ۔

[2] ELIZABETH KEIGHTLEY : VENEREAL DISEASES IN WOMEN PRISONERS . (PUBLISHED IN BRITISH JOURNAL OF VENEREAL DISEASES . 1957)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۶۳ء میں ہولووے جیل میں چار سو پندرہ کنجریاں تھیں۔ جن میں سے ۸۵ یعنی ۲۰ فیصد کی عمر پندرہ سے بیس سال کی تھی۔ ان میں سے اُنتالیس حاملہ تھیں اور ۲۰ فیصد کو سوزاک تھا۔

کراچی کے "ڈیلی نیوز" اخبار مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۷۰ء میں لندن سے موصول شدہ ایک خبر میں درج ہے کہ اپریل ۱۹۶۹ء میں پاس شدہ قانون کی وجہ سے جس کی رو سے اسقاط الحمل کی اجازت دی گئی تھی، انگلستان میں چالیس ہزار اسقاط الحمل کے واقعات ہو چکے ہیں۔ جن میں سے قریباً ایک ہزار سولہ سال سے کم عمر کی بچیوں کے تھے۔

عورت کے مرد بننے کی خواہش سے اور مردوں کی جنسی تسکین کی عدم تکمیل کے باعث اغلام کئی مردوں کے لیے جنسی خوش وقتی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ ہر حالت میں مغربی عورت کے بدلے ہوئے کردار کو مغرب میں بڑھتے ہوئے اغلام سے بے تعلق نہیں سمجھا جا سکتا۔ مغربی اور شمالی یورپ میں طرفین کی رضامندی کی صورت میں اغلام قانونی طور پر جرم نہیں سمجھا جاتا۔ انگلستان میں ولفنڈن رپورٹ[1] بھی اسی بات کے حق میں تھی۔ امریکہ میں بھی ایک متعلقہ کمیٹی نے یہی رائے دی ہے اور وہاں بھی غالباً قانونی طور پر اغلام کی آزادی ہو جائے گی۔ نیز انگلستان، ڈنمارک، جرمنی، فرانس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے آخری بیس سال کے ادب، سینما، آرٹ میں اسی طرف میلان کے حوالے ملتے ہیں۔[2]

انگلستان میں تیرہ فیصد سوزاک کے مریض اغلام کے ذریعے یہ مرض حاصل

[1] WOLFENDEN REPORT: "REPORT OF THE COMMITTEE ON HOMOSEXUAL OFFENCED AND PROSTITUTION."

[2] E.G. JEAN PAUL SARTRE: INTIMACY

کرتے ہیں۔

سینٹ میریز ہسپتال کے ریکارڈ کے مطابق ۶۲-۱۹۶۰ء میں اس ہسپتال میں ۶۵ فیصد آتشک کے مرد مریضوں نے یہ مرض اغلام کے ذریعے حاصل کیا۔

سینٹ ٹامس ہسپتال لندن کے کاغذات کے مطابق اس ہسپتال کے قریباً ۱۳ فیصد آتشک کے مریضوں نے یہ مرض اغلام کے ذریعے حاصل کیا۔ یہی حالات باقی مغربی یورپ اور سکنڈے نیویا میں ہیں۔

کنسے[1] کے مطابق ۳۷ فیصد امریکن مرد اغلام کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ۴ فیصد امریکن اغلام کے سوا کوئی اور جنسی تجربہ ہی نہیں رکھتے۔ پادری اور آرٹسٹ اغلام کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہیں اور شراب خوری بے احتیاطی پیدا کر کے ان بدکاریوں اور بیماریوں کی وجہ بنتی ہے۔

مغرب میں ان حالات سے گھبرا کر لڑکوں اور لڑکیوں کو جنسیات کی تعلیم دی جانی شروع ہو گئی ہے۔ یعنی جو ذہنی لطف وہ جنسی ادب و فن سے بالواسطہ اور کنایتاً حاصل کرتے تھے، اب براہِ راست انہیں تعلیم کے نام پر مہیا کر دیا جاتا ہے لیکن بقول آر۔ ایس۔ مورٹن "محض معاشرتی حالات اور قوانینِ حیات علم جنسی جذبات کی روک تھام نہیں کر سکتا۔" تجربہ کی بناء پر مغرب میں بہت سی سوسائٹیاں جنسی تعلیم کی مخالفت کر رہی ہیں۔

یونانی تہذیب بے علمی کو گناہ سمجھتی تھی کیونکہ انسان علم رکھتے ہوئے غلط راہ اختیار نہیں کر سکتا۔ لیکن وقت گذرنے سے خود شناسی میں بھی ترقی ہوئی۔

[1] KINSEY, A.C. / POMEROY, W.B. / MARTIN, C.E — SEX BEHAVIOUR IN THE HUMAN MALE

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان درست راستہ جانتے ہوئے بھی غلط راہ اختیار کر سکتا ہے۔ اس طرح گناہ اور جزا و سزا کے مسائل ظہور میں آتے ہیں۔ غرض تعلیم جنسیات ممکن ہے مست شباب فطرت کی غلط رہنمائی کرے۔ اور مضمون کی دل چسپی میں اصل مقصد فوت ہو جائے۔

عجیب بات یہ ہے کہ باوجود عورت اور مرد کی جنسی آزادی کے اور باوجود اغلام کی قانونی اجازت کے، مغرب میں زنا بالجبر کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ غرض جنسی امراض اور جنسی جرائم ایک معاشرے کی ذہنی بیماری کی علامات ہیں۔ حقائق کی خنک جانچ، منظم قومی ضمیر اور پاکیزہ روایات کا احترام ہی ہمارے معاشرے کو مغرب کی بربادیوں کی غلامانہ نقل سے روک سکتے ہیں۔

اسلامی دنیا کے احساسِ کمتری کا باعث مغرب کی عناصرِ قوت میں برتری ہے۔ تمام اسلامی دنیا اپنے کارخانوں میں اپنے سامان سے موٹر کار، ریلوے انجن، ہوٹزر توپ، بارود، ایٹمی بم، ریڈار کے آلات، بزوکا، بری و بحری مائن، جنگی جہاز، ایئر کرافٹ کیریر، تار پیڈو، اعلیٰ ادویات وغیرہ کی قسم کی اشیاء نہیں بنا سکتی۔ لیکن اکثر مسلمان، نائیوں، درزیوں، ناچ گھروں، شراب خانوں کی امداد سے یورپ کی ظاہری نقل میں وقار کے متلاشی ہیں۔ یورپ کی تمام معاشرتی بربادیاں اپنانے سے چاند پہ پہنچنے کے راکٹ نہیں بنا کرتے۔ وہ اقوام جو راکٹوں سے چاند پہ پہنچ رہی ہیں، اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کے قابلِ فخر کارنامے علمی و عملی سائنس کی بنیاد پر صنعتی ترقی کی وجہ سے ممکن ہوئے ہیں نہ کہ شراب خوری یا جنسی بدنظمی کی وجہ سے مشرق میں مغرب کا گرین روم سجا کر مغرب کی بیمار معاشرت کی پلے ایکٹنگ سے مشرق میں سائنسی ترقی اور مناسب اقتصادی تنظیم نہیں ہو سکتی۔ عناصرِ قوت حاصل کرنے سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ خود فریبی عقل کا بدل نہیں بن سکتی۔

عورت اور مرد کی برابری کے متعلق جو باتیں کہی جاتی ہیں، وہ بھی ٹھنڈے دل سے سوچنے پر غیر یقینی ثابت ہوتی ہیں۔ یہ کہ ہر عورت مردوں کے کام مردوں کی طرح کر سکتی ہے غور طلب امر ہے۔ عورت مرد سے اوسطاً بارہ سنٹی میٹر چھوٹی ہوتی ہے۔ مرد کا دماغ عورت کے دماغ سے اوسطاً ایک سو ڈرام زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ مرد کے دماغ کی ساخت عورت کے دماغ کی ساخت سے زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔

پاکستان کے رسالہ "اردو ڈائجسٹ" کے دسمبر ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں ڈاکٹر ایڈن شینڈلر کے مضمون کا ترجمہ شائع ہوا تھا۔ جس کا عنوان تھا:-

"پندرہ باتیں جن میں عورت مرد سے مختلف ہے"

اس مضمون میں علاوہ دوسری باتوں کے ڈاکٹر شینڈلر بتاتے ہیں کہ مرد کے خون میں عورت کے خون کی نسبت سرخ ذرات دس فیصد زائد ہوتے ہیں، لیکن عورت کے جسم میں خون کی افزائش آسانی اور تیزی سے ہوتی ہے۔ مرد کا خون زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ مرد کا دل عورت کے مقابلے میں سست رفتار ہے۔ عورت کا دل اور اس کے پھیپھڑے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ایک منٹ میں عورت مرد سے زیادہ سانس لیتی ہے اور سخت کام کرتے ہوئے اس کی سانس جلد پھول جاتی ہے۔ فی منٹ عورت کے دل کی دھڑکنیں مرد سے دس زیادہ ہیں۔ جسمانی قوت میں مرد زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ زیادہ مشقت طلب کام عورت کی حیاتیاتی بناوٹ سے مطابقت نہیں رکھتا۔

"طبی تحقیق کے مطابق عورت کا معدہ بڑا ہوتا ہے اور وہ خوراک جلدی اور آسانی سے ہضم کرتی ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ عورت زیادہ موٹاپے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ مرد کے مقابلے میں عورت کی نشوونما تیزی سے ہوتی ہے اور اسی تناسب سے اس کا وزن بڑھتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھیل کے میدان میں عورت مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی "۔ عورت کے جسم میں کہنی اور کلائی کی ہڈیاں آپس میں ایسے زاویوں سے ملتی ہیں کہ ہاتھ تیزی سے گیند کو گھما نہیں سکتا ۔ اس کی جسمانی بناوٹ سیڑھیاں چڑھنے میں بھی دشواری پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح اس کے کولھوں اور گھٹنے کی ہڈیوں کے جوڑ اُسے کوہ پیمائی میں کامیاب ہونے نہیں دیتے "۔ مرد کی صوتی رگیں عورت کی صوتی رگوں سے لمبائی میں دُگنی ہوتی ہیں ۔ عورت اور مرد کے غدودوں کے افعال میں بھی بہت فرق ہے ۔

مرد کا ذہن عملی ہوتا ہے اور عورت کا تخیّلی ۔ خواب دیکھنے کی عادت مرد کے مقابلے میں عورت میں زیادہ ہوتی ہے ۔ عورت جلد مضطرب اور خائف ہو جاتی ہے۔

"مرد کے مقابلے میں کسی پریشانی پر عورت کا ردّ عمل ایک اور پانچ ہے "۔

پھر ڈاکٹر شینڈلر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عورت کا دائرۂ کار مرد کے دائرۂ کار سے قطعی مختلف ہے " اور خدا نے انہیں الگ الگ کاموں کے لیے پیدا کیا ہے "۔

لیکن مغربی عورت جنسی اختلافات کے احساس کو اپنی ذلّت خیال کرتی ہے جب عورت محافظ مرد اور دودھ مانگنے والے بچّے کی خواہش پوری کرتی ہے تو وہ محکومی نہیں بلکہ اپنی بنیادی فطرت کا اظہار کرتی ہے ۔ اس بنیادی فطرت کو انقلابِ فرانس بدل نہیں سکتا ۔ "آزادی" اور "برابری" کی سرخوشی میں مغربی عورت اپنی فطری تسکین برباد کر چکی ہے ۔ جو عورتیں محبّت میں تسلیم و خود سپردگی کا رویہ رکھتی ہیں وہ خاوند سے بہت زیادہ محبّت کا خراج وصول کرتی ہیں بہ نسبت ان عورتوں کے، جو سیکنڈ ہینڈ سیاسی اصولوں سے متاثر ہو کر غلط مردانہ رویّے اختیار کر لیتی ہیں اور جنسی بغاوت ان کی اپنی نفسیاتی بربادی بن جاتی ہے ۔

"اعداد و شمار یہ واضح کرتے ہیں کہ مرد کی کام کرنے اور کمانے کی طاقت اور قابلیّت ۳۰ فیصد سے ۶۰ فیصد تک بڑھ جاتی ہے جب اس کی بیوی اس کا

گھر سنبھال لیتی ہے "۔ اس[1] طرح گھر ہستی عورت فی الحقیقت ملازمت کرنے والی عورت سے زیادہ کماتی ہے ۔ عام طور پر خاوند کی ۸۰ فیصد کمائی عورت کے ہاتھ سے ہی خرچ ہوتی ہے ۔ امریکی عورتوں کی دولت کا زیادہ حصّہ اُنہیں کمائی سے حاصل نہیں ہوا، بلکہ مردوں سے ورثہ میں ملا ہے ۔

اس کے علاوہ تمام ملکوں کے اعداد و شمار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ شادی شُدہ مردوں اور عورتوں کی عمریں غیر شادی شدہ انسانوں کی عمر سے زیادہ دراز اور صحت مند ہوتی ہیں ۔

مرد فطرتاً عورت کا عاشق اور پرستار ہے ۔ زر اور زمین کے لیے اتنی یکیکی لڑائیاں (DUEL) نہیں ہوئیں جتنی عورتوں کے لیے ۔ مہذّب عورت اپنے رویّے سے مرد کو بیگانہ بنا رہی ہے ۔ جنس عجیب معمّہ ہے ۔ خاوند کو پجاری بنانے کے لیے خاوند کو دیوتا کی طرح پوجنا پڑتا ہے ۔ وہ عورتیں پجاری خاوندوں پر حکمرانی کرتی ہیں جو تسلیم و رضا سے اپنی نسوانیت کے تقاضے پورے کرتی ہیں ۔ ویسے ہر وفاداری کو غلامی کہا جا سکتا ہے خواہ وہ مذہب سے ہو یا ملک سے یا پھر رفیقِ حیات سے ۔

سیاسی اور اقتصادی آزادی کے ذریعے مغربی عورت مرد بننے کی کوشش میں اپنی فطرتی نسوانیت کی خودکُشی میں مصروف ہے ۔ اپنی بنیادی جنسی تسکین کے لیے عورت کو اپنی نسوانیت کو تسلیم کرنا ضروری ہے ۔ وہ خاوند سے محبّت کرنے میں اپنی نسوانیت کی معراج کو پہنچتی ہے، لیکن خود نسوانی سوسائٹی اب نسوانی نفسیات کے تقاضوں کو قابلِ ستائش نہیں سمجھتی ۔ اس طرح بیوی نفسیاتی طور پر خاوند کی خفیہ رقیب بن جاتی ہے ۔ مردانہ ذہن بنا کر عورتیں اپنی ذہنی ٹریجیڈی کا انتظام

[1] لنڈبرگ اور فارنہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتی ہیں۔ عورت کی موجودہ دو جنسی زندگی کا حل آزاد نفسیاتی ایمانداری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

آزاد معاشرے میں کئی شادیاں محض نام کی شادیاں ہوتی ہیں۔ آزادی عورت کا نسوانی فرائض سے فرار ہے، یعنی خاوند سے محبت کے مسلّمہ تقاضوں سے اور بچّوں کی تربیت کی ذمہ داری سے۔ امریکہ میں بیس فیصد شادیاں طلاق میں منتج ہوتی ہیں۔ بلاطلاق علیٰحدگیاں پچاس ہزار سالانہ ہوں گی۔ کئی شادیاں بچّوں، مذہب اور معاشرہ کے لیے محض ظاہراً قائم رکھی جاتی ہیں۔ ان حالات کا انجام نیوروسس، شراب خوری جنسی بدنظمی، آتشک، ناجائز اور مشتبہ اولاد ہونا لازمی ہے۔ باوجود ان تمام آزادیوں کے ۱۹۴۲ء میں امریکہ میں زنا بالجبر کے واقعات کی تعداد دس ہزار ایک سو ساٹھ تھی۔ اور تمام مغرب میں اغلام جنسی تسکین کا قانونی طور پر جائز ذریعہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔

پروفیسر جے۔ پی شالو[1] کے خیال میں شریف اور معزز طبقوں میں جرائم کی وجہ موجودہ زمانے کی انفرادی آزادی کا عقیدہ ہے۔

جے۔ او۔ ہیئر[2] ایک خاتون جو میڈیکو سوشل کارکن کی حیثیت سے سینٹ میری ہسپتال سے تعلق رکھتی ہیں، اپنے ایک آرٹیکل "جنسی بدنظمی کا راستہ" میں لکھتی ہیں کہ ایک سو "آزاد" جنسی تعلقات رکھنے والی لڑکیوں میں سے چھیاسی لڑکیاں مالی لحاظ سے مستحکم گھرانوں کی ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ گھرانے ان لڑکیوں کو آسائش و آرام مہیا کرتے ہیں لیکن "ضبط، نظم اور بوریت سے انہیں گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ وہ بالکل خودمختار اور آزاد ہوں اور جو بھی اُن کی خواہش ہو وہ فوراً پوری ہو جائے۔ یہ لڑکیاں محض خوشگوار لمحوں کے لیے زندہ رہنا شروع کر دیتی ہیں۔"

---

[1] PROF. J.P. SHALOO : THE FEDERAL PROBATION

[2] J.O. HARE : THE ROAD TO PROMISCUITY

ڈاکٹر مورٹن کے نزدیک لڑکیوں کی جنسی سرگرمیاں فطرت کی مجبوری کی وجہ سے نہیں ہوتیں۔ مورٹن کے خیال میں پیشہ ور کنجریوں کے علاوہ پارٹ ٹائم پوشیدہ فاحشہ پن یورپ میں عام ہے۔ ۱۹۶۲ء میں جب جاپان میں فاحشاؤں کا امتحان ہوا تو رجسٹرڈ قحبہ خانوں کی پیشہ ور کنجریوں میں سے ۱۰ء۶۷ فیصد کو جنسی امراض تھے، لیکن باہر کی پوشیدہ فاحشاؤں میں سے ۴۲ء۶۲ جنسی امراض میں مبتلا تھیں۔ فرانس میں پیشہ ور کنجریاں صرف تہائی جنسی امراض کی ذمہ دار ہیں۔ دو تہائی جنسی امراض کی ذمہ دار نام نہاد شریف زادیاں اور معزز گھرہستی بیویاں ہیں۔

جنسی امراض والی لڑکیاں جو مس پونٹنگ[1] کے مشاہدہ میں آئی ہیں اُن میں سے اکثر معزز خاندانوں کی تھیں۔ لیکن خاندان اب یورپ میں شکستہ ادارہ ہے۔ باپ کی اکثر خاندانوں میں کوئی وقعت نہیں رہی۔ جمہوری معاشرہ ہر قسم کے دباؤ کے خلاف ہے خواہ وہ اخلاقی ہو اور اولاد یا شاگردوں کی بہتری کے لیے ہو۔ انفرادی آزادی پر کوئی رکاوٹ برداشت نہیں کی جا سکتی۔ جمہوریت کی سیاسی ذہنیت، خاندان، تعلیمی نظام اور تہذیب کی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہے۔

مس ایلینر فرنچ[2] جنسی امراض والی لڑکیوں کی بدقسمتی کی یہ وجوہات بتاتی ہیں۔ "دُنیا سے بغاوت کا احساس، بے پروائی اور شیریں دروغ گوئی کی طرف میلان"۔ اُن کے خیال میں ایسی عورتیں ذہنی طور پر ایسی ہی مجرم ہیں، جیسے وہ مرد جو مختلف جرائم کی وجہ سے جیل میں ہیں۔

---

[1] PONTING : SOCIAL ASPECTS OF VENEREAL DISEASES IN YOUNG PEOPLE IN LEEDS AND LONDON (ARTICLE)

[2] ELEANOR FRENCH : PROSTITUTION

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یورپ میں دولت کی فراوانی کی وجہ سے محض غریبی اور ناداری زنانہ فحاشی کی وجہ نہیں بن سکتی۔ لڑکیوں میں جنسی امراض کی بڑی وجہ مکمل مجلسی اور جنسی آزادی کی خواہش اور ماں باپ کے خلاف بغاوت ہے۔

جب جنسی سرگرمی محض تجربتاً اور اتفاقی رفقاء سے عمل میں آتی ہے، تو ایسی سرگرمی دونوں طرف مکمل جنسی تسکین نہیں دے سکتی۔ انفرادی انانیت عورت کی سپردگی میں حائل ہو کر معاملات کو گناہِ بے لذت بنا دیتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات کے مطالعے جو عورتوں کے جنسی عمل کو تجربتاً قبول کرنے کے متعلق ہیں، ظاہر کرتے ہیں کہ عورتیں اس عمل میں مسرت سے محروم رہیں۔ ممکن ہے یہ محض نسوانی طرزِ بیان ہو کیونکہ انہی تجربوں کی آزادی نسوانی فردوس ہے۔ لیکن یہ فرضی فردوس خود فطرتی نسوانیت کی قربانی سے حاصل ہوتا ہے۔

ایک بچہ اس دنیا میں طاقت کی نشانی ہے۔ دنیا کی حکومت اس ہاتھ میں ہے جو گہوارہ ہلاتا ہے۔ اپنے آئینے میں ایک عورت اشرف المخلوقات کی آئندہ تقدیر پہ نگاہ کرتی ہے۔ ماں جو جسمانی اور نفسیاتی انسان بناتی ہے فطرتاً انسان کی قسمت کی مالک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ عورت کا بچہ زائیدگی سے احتراز بے سود جنسی عمل کو بے مسرت بنا دیتا ہے۔ تکمیلِ عمل کے لیے یہ ضروری ہے کہ عورت کو یقین ہو کہ مرد ہر حالت میں اس کا رفیق اور محافظ ہے اور وہ اس کو اور اس کی اولاد کو اپنی بیوی اور اپنی اولاد کی حیثیت سے تسلیم کرے گا۔ لیکن آزاد جنسیت میں عورت کو یہ یقین نہیں ہوتا اور اس کا اثر جنسی عمل، مسرت و تکمیل پہ پڑتا ہے۔ مرد کی دلچسپی خوشگوار لمحوں میں ہوتی ہے نہ کہ عورت میں یا اس کی ممکن اولاد میں۔

ان حالات کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ یورپ کے اکثر مردوں اور عورتوں میں ایک دائمی احساسِ تنہائی رہتا ہے۔ یہ تنہائی جب ہی دور ہو سکتی ہے جب قابلِ اعتماد محبت

ایک روح کی کھڑکیاں دوسری روح میں کھول دے۔ اپنی دائمی وفاداری اور کسی کے ہمیشہ اپنا ہونے اور اپنا رہنے کا یقین، جسمانی و روحانی خود سپردگی کا احساس۔ غرض سچی محبت کے نرم جذبے کے ذریعے ہی ہماری روح کی خوفناک تنہائی دور ہو سکتی ہے۔ قابلِ اعتماد رفاقت کا احساس زندگی کے سفر کو قابلِ مسرت بنا سکتا ہے۔ مشرقی اسلامی زندگی میں ابھی تک ایسی زندگی کے امکانات موجود تھے۔ اب یہ احساسِ تنہائی جسے آزاد جنسی تجربے دور نہ کر سکیں گے، مغربی معاشرت کی نقل سے ہماری معاشرت میں بھی داخل ہو رہا ہے۔

عناصرِ قوت کے ذریعے مغرب، قوت تو حاصل کر سکا، لیکن وہ خوبصورتی جو حیاتِ انسانی میں اسلامی تنظیم سے پیدا ہو سکتی تھی، حاصل نہ کر سکا۔ بیرونِ اسلام حالات کا درست مطالعہ اسلامی روایات کے تحفظ کی دلیل بن جاتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ ہم عناصرِ قوت کے حصول کی سعی جاری رکھتے رہے تو وہ زمانہ آ سکتا ہے کہ خود مغربی قومیں اسلامی روایات کو سراہتی نظر آئیں۔ بہرحال اس وقت ہماری سلامتی اسی لائحہ عمل کو اختیار کرنے میں نظر آتی ہے ؎

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ۲

ادب و فن کا ایک پہلو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دو عالمی جنگوں کے بعد جنسی اخلاقیات کے آخری سہارے جو انیسویں صدی سے بچ رہے تھے تھرتھراتے اور گرتے نظر آتے ہیں۔ مغربی اقوام کے لیڈر، فلسفی اور معلّم اخلاقیات کی اس بربادی کو "نئی اخلاقیات" کے نام سے باوقار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بقول لنڈبرگ اور فارنہم "اگر جو یورپ اور امریکہ میں ہو رہا ہے اسے 'نئی اخلاقیات' سمجھا جائے تو چڑیا گھر کے بندروں کے پنجرے میں ہر روز نئی اخلاقیات جنم لیتی ہے۔"

آج کل فن کار وہ فن پیدا کرتے ہیں جو عوام کی جنسی آزادی کی خواہشوں کو تسکین دے۔ مصنّف ادب کو تصویرِ حیات کہہ کر کوائفِ حیات سے چند قدم آگے رہتے ہیں۔ تاکہ انہیں ترقی کے فلسفی اور جنسی انقلاب کے حامی خیال کیا جائے۔ انسان ایک ہولناک خفیہ دُکھ کے پنجے میں تلملاتا نظر آتا ہے، جس کا علاج رُوح کی وہ تسکین ہے، جو جنسی اخلاقیات سے مکمل آزادی میں نظر آتی ہے۔ سینما، آرٹ، ناول اور جرائد ان خواہشات کی تصاویر کو حُسن سے مزیّن اور امید کی روشنی سے منوّر کرتے ہیں یا حقائق کے طور پر دکھاتے ہیں تاکہ پبلک کی جنسی نفسیات کی تسلی ہو۔

مشرق میں مغربی فن و ادب کی نقل کی کوشش میں ناقابلِ قبول تکنیک کو اپنانے کی نیّت سے عجیب الخلقت فنّی اور ادبی کیکڑے پیدا کیے جاتے ہیں۔ سُرریلزم، امپریشنزم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور کئی مغربی ازم ادب و فن میں محض نقالی کے طور پر درآمد کیے جاتے ہیں۔ کئی دفعہ ہمارے ادیب یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مغربی ادب کے خیالات و مطالب ہی ہمارے معاشرے کے خیالات و مطالب ہیں۔ اگر ہمارا معاشرہ مغربی زندگی سے کچھ مختلف دھندلکے رکھتا ہے تو وہ اپنے معاشرے کی پستی پر فلسفیانہ حقارت کا اظہار کرتے ہیں۔ مغرب کے ادب کی نقل وقار کے حصول کی ایک کوشش ہے، جیسے ترقی پسندی کا ایک پہلو سمجھا جاتا ہے۔ کس کی ترقی؟ غالباً مغربی اور اشتراکی ادب کی نقل کی ترقی۔ سنیما، ریڈیو، ناول، اخباری فوٹو اور اشتہاروں میں جنسی مضامین ہر روز دہرائے جاتے ہیں۔ تشنہ لب سرابوں سے دل کو بہلاتے ہیں۔ فنون میں زندگی کے فرضی سائے پکڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جنسیت فن سے ہمیشہ متعلق رہی ہے۔ مگر یہ وبائی کیفیت پہلے کبھی موجود نہ تھی۔

پھر فنون و ادب میں سائنس اور نفسیات کے نام پر جنسی بدنظمی کو طبی حیثیت دے دی جاتی ہے۔ غالباً اس عمل کا سب سے بڑا پیغمبر سگمنڈ فرائیڈ ہے۔ جس کی تحلیلِ نفسی کو یورپ کا عصرِ جدید مقدس صحیفہ سمجھتا ہے۔ وائنا کے اس ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ (۱۹۳۹-۱۸۵۶ء) کے نزدیک جنسی ضبط اضطراب اور مایوسی کا باعث ہے اعصابی امراض (نیوروسس) جنسی تسکین نہ مل سکنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اعصابی بگاڑ کی بنیاد وہ مشکلات ہیں جو حالات یا معاشرے کے اصول جنسی تسکین کی راہ میں حائل کرتے ہیں۔ شادی اور اخلاقیات ان معاملات میں اعصابی صحت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ نفسیاتی فردوس کا راستہ اخلاقی اصولوں کی بربادی سے کھلتا ہے۔ اس طرح سائنس اور نفسیاتی طب بدکرداری کا جواز بن جاتے ہیں۔

فرائیڈ کے خیال میں نیوروسس یعنی تشنج اعصاب کی کیفیت جنسی ضبط سے پیدا ہوتی ہے۔ جنسی بے ضبطی صحت ہے اور اس کی نفی مرض اور موت۔

ممکن ہے کہ فرائیڈ دانستہ اس قسم کے جنسی حالات سے گھرا ہوا تھا کہ اس کا مشاہدہ اور متخیلہ انہی نتائج تک پہنچ سکتا تھا۔ اس کی تشریح میں انسان جنس ہے اور جنس انسان۔ فن، ایجاد، فلسفہ اس کے نزدیک فقط جنس کی سبلیمیشن (یعنی ارتفاع) ہیں۔ دوستی اور والدین کی محبت فرائیڈ کے نزدیک جنسیت کے پہلو ہیں۔

فرائیڈ تمام اعصابی نظام کو جنس سمجھتا ہے۔ حالانکہ جنس اعصابی نظام کا فقط ایک پہلو ہے۔ فطرت کے ہر تقاضے کا ضبط مثلاً کھانا نہ ملنا، سونے نہ دیا جانا، قید کر دیا جانا، زبردستی دیکھنے یا سننے سے محروم کر دیا جانا، نیوروسس کی وجہ بن سکتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان خودشناسی کی تربیت سے شخصیت کی اُن اعلیٰ سطحوں پر نہیں پہنچ سکتا، جہاں ضبط خود خوشی ہو اور بدنظمی فرسٹریشن پیدا کرے؟ کیا والدین کے ویٹو (VETO) اُستادوں کا تعلیم کے لیے کام کرانا، دوسرے انسانوں کے احترام کی مجبوریاں، صرف ضبط کی تلخی اور بغاوتی ردِعمل ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہٹلر کے حملے کے موقع پر انگریزی ہوا بازوں نے خودکشی کی حد تک اپنے ملک کی حفاظت کے لیے قربان ہونے کا عہد کر لیا۔ ہٹلر کو انگلستان پر ہوائی حملے میں شکست ہوئی۔ پاکستانی سپاہی اور افسر دشمن کی کئی گنا فوج سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی خوشی سے شہید ہو گئے۔ ہر عظمت کو جنس کی سبلیمیشن کہہ دینا درست نفسیاتی تجزیہ نہیں ہے بلکہ SEXOMANIA یعنی جنسی دیوانگی ہو گی۔ بھوکے کو چاند سورج روٹیاں نظر آتی ہیں، جو اُسے بھوکا رکھنے کے لیے دشمنوں نے آسمان پر پھینک دی ہیں۔ انسان کی بنیادی فطرت حیوانی ہے۔ لیکن انسان نے ایک اعلیٰ شخصیت بھی پیدا کی ہے، جس کی وجہ سے وہ حیوانی فطرت کے آگے بالکل بے بس نہیں ہے۔ یہ اعلیٰ شخصیت بھی فطرت کی ارتقا یافتہ صورت ہے اور تعلیم و تربیت، مثال اور روایات سے مضبوط اور مضبوط تر بنائی جا سکتی ہے۔ خودشناسی ارتقاء کو شعوری عمل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنا سکتی ہے۔ انسان میں عظمت کی خواہش خود جنس کی طرح فطری صداقت ہے۔ جب انسان کی رُوح رفعت کی طرف مائل ہوتی ہے تو جنسی تقاضے خود ہی کمزور پڑ جاتے ہیں۔ یہ فطرت کا ہی آخری پیغام ہے۔ اسلام انسان کی روحانی بلوغت کا نام ہے۔

جس طرح ہر انتظام سے پہلے بدنظمی تھی جس کی تبدیل شدہ شکل انتظام ہے اسی طرح اعلیٰ فطرت سے پہلے ادنیٰ فطرت تھی جو اعلیٰ فطرت میں مضمر ہے اور ہر بلوغت کی بنیاد بچپن اور لڑکپن ہیں۔ اگر سگمنڈ فرائیڈ نے انسان کی حیوانی بنیاد واضح کی ہے تو اس سے اُس بنیاد پر خوبصورت انسانیت کی عمارت تعمیر کرنے کا جواز اور اس کی ضرورت ختم نہیں ہو جاتے۔ اسلام جنسی خواہشات کو اعلیٰ مقاصد کے لیے منظّم طور پر پورا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بنیادی طور پر حیوان ہونے سے انسان کا انسان نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے کئی ادیب ادب کو انسان کی حالت بہتر بنانے کی بجائے مغرب کی بیمار اور ابتر حالت کی قصیدہ گوئی اور نقل میں مصروف ہیں۔

سگمنڈ فرائیڈ نے فرسٹریشن یعنی احساس محرومی کا خوف مغربی ذہن پر طاری کر دیا ہے۔ یہ فرسٹریشن ہر نامعقول جنسی خواہش کی عملی تسکین سے دُور ہو سکتی ہے لیکن ممکن ہے کہ ایسی تسکین انسان کی اعلیٰ شخصیت یا اعلےٰ فطرت کے لیے بے پناہ فرسٹریشن کا باعث ہو۔ یہ بے معنی ہے کہ ہم میکبیتھ کی فرسٹریشن کو دُور کرنے کے لیے ڈنکن کے قتل کو جائز سمجھیں۔ نفسیاتِ انسانی کے محض خواہش اور فرسٹریشن کے علاوہ اور بھی کئی پہلو ہیں۔ جن کی مناسب تربیت سے انسان کی ارضی زندگی منظّم مسرّت بن سکتی ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ کی صداقتوں کی حدود واضح نظر آتی ہیں۔

زندگی کی ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ اس لحاظ سے تمام زندگی ایک دراز فرسٹریشن ہے۔ خواہشات کا دائرہ معقولیت اور امکان کی حدود سے زیادہ وسیع ہے۔ پھر لاشعور کے جنگل میں بہت سی بھیانک بلائیں موجود رہتی ہیں لیکن انسان

کا ذہنی ارتقاء حیوانی فطرت یا لاشعور سے عقل و شعور کے درجے تک اس لیے پہنچا کیونکہ جذبات کو منظم کرنے سے زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تسکین ممکن تھی اور جذبات کی تنظیم انسانی بقاء اور اجتماعی زندگی کی خوبصورتی کے لیے ضروری تھی۔ نیز اعلیٰ فطرت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ ہر جنسی خواہش کو پورا کرنا یا محروم ہو کر باغی یا پاگل بن جانا ایک نفسیاتی منزل ہے، جس سے انسان آگے ترقی کر رہا ہے۔ لیکن جنسی حیات اور ادب میں مغرب قبل از انسانیت عہد رفتہ کو آواز دینے میں مشغول ہے۔

آج کل مشرق کے کچھ ادیب ادب دفن کے ذریعے اپنی شخصیت کو مغرب کی نقل میں پھر سے نابالغ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور رومان کی ہمہ گیر اصطلاح اس کوشش پر بھی چسپاں ہو سکتی ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ کی قوتِ تشریح کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اگر ہم معقولیت، تعلیم، تربیت اور مذہب کو نظر انداز کر دیں گے تو بھی ہماری اعلیٰ شخصیت ایک قسم کی فرسٹریشن محسوس کرے گی۔ نیز عناصرِ قوت مغرب کے جنسی خیالات اپنانے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

یورپ کے فنون و ادب سگمنڈ فرائیڈ سے اس لیے متاثر ہیں کہ سگمنڈ فرائیڈ مغرب کی عام زندگی اور انفرادی خواہشات کو سائنسی اساس مہیا کرتا ہے لیکن اگر اس کے نتائج پر مشرقی مفکّر کافی گہرا غور کریں تو یہی فلسفہ اسلامی جنسی اخلاقیات اور طرزِ عمل کا سائنسی جواز بن سکتا ہے۔ اگر ادب بہتر زندگی کا راستہ دکھاتا ہے تو مشرقی ادیب اُس اعلیٰ شخصیّت کی طرف توجہ دلا سکتے ہیں جو فطرتاً اشرف المخلوقات کے ہر فرد کی نفسیات میں مضمر ہے اور اس اعلیٰ معاشرہ کی طرف توجہ دلا سکتے ہیں۔ جو تعلیم و تربیت انسانی جذبات کی معقول تنظیم سے بنا سکتے ہیں کیونکہ فرائیڈ ایک انسان کی تسکین پر فکر کرتے ہوئے باقی معاشرے کے حقوق اور ان کی تسکین کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ جو تخریبی طرزِ خیال ہے اور جو اجتماعی زندگی میں ناقابلِ عمل ہو گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرائیڈ مغربی زندگی کی خود شناسی کا مرکز ہے اور مغربی ادب و فن اُس سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ مگر مشرقی ادب حیاتِ مشرق کے تجزیہ کی بجائے صرف مغرب کی ادبی تحریکوں کی ادنیٰ علمبرداری کے فرائض ادا کر رہا ہے اور اس طرح تخلیقِ حُسن میں مغربی زندگی کی قصیدہ خوانی کرتا ہے۔ فرائیڈ کی سند پر جنسی پروپیگنڈہ محض عناصرِ قوت میں مغرب کی موجودہ برتری سے مشرق میں پیدا شدہ احساسِ کمتری کے اثرات میں سے ہے۔ مشرقی ادیبوں کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ زیادہ خود شناسی سے کام لیں۔ یہ بھول جانا نامناسب طرزِ فکر نہ ہوگا کہ مغرب شش جہات میں سے صرف ایک طرف ہے۔ اور وقارِ مغرب پر اپنی ثقافتی روایات کو قربان کرنے سے مشرق کو عناصرِ قوت حاصل کرنے میں کوئی امداد نہیں مل سکتی۔

ضمیمہ ۳

عربی سائنس اور یورپ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ۳

اسلام کی مسلسل فتوحات نے جو ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہوئیں گیارھویں صدی تک یورپ کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ مسلمانوں کی طاقت کا مقابلہ محض مذہبی لڑائیوں اور تعدادِ افواج سے نہیں ہو سکتا اور مسلمانوں کے عناصرِ قوت یعنی علمی و عملی سائنس کو حاصل کرنے سے ہی عیسائی یورپ مسلمانوں سے مقابلہ کر سکے گا۔ یورپ میں اس خیال کے تحت عربی زبان کا مطالعہ شروع ہو گیا تھا۔ یورپ کا عربی زبان کے ذریعے عربی سائنس کو حاصل کرنا اور پھر اُسے ترقی دے کر اسلامی ممالک پر غالب آنا ایک دراز داستان ہے جس کے لیے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ مختصراً یہ کہ بارھویں صدی میں یورپ نے عربی سے لاطینی میں ترجمہ کر کے سائنس کے اُن ذخائر سے مستفید ہونا شروع کیا، جنہیں عرب دوسری تہذیبوں سے حاصل کر کے ترقی دے رہے تھے۔

ذیل میں پروفیسر اے۔ آر۔ کرامبی[1] سے ماخوذ فہرست اُن ترجموں کی ہے جو یورپ

---

[1] A.R. CROMBIE : AUGUSTINE TO GALILEO.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ۳

میں بارھویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں کیے گئے :-

بارھویں صدی میں		
مصنّف	لاطینی میں تصنیف یا ترجمہ	مترجم
جابر ابن حیّان (۷۸۶ء میں زندہ تھا)	کیمیا پر کئی کتب	×
الخوارزمی	حساب۔ ٹرگنومیٹری۔ الجبرا	رابرٹ (از شہر چیسٹر۔ انگلستان) ایڈیلارڈ (از شہر باتھ۔ انگلستان)
الکندی (وفات ۸۷۳ء)	DE ASPECTIBUS DE UMBRIO ET DE DIVERSITATE ASPECTUM	جیرارڈ کریمونوی (طولیدو)
ثابت بن قرّہ	LIBER CHARASTONIS	〃
رازی (وفات ۹۲۴ء)	DE ALUMINIBUS (علم کیمیا) (طبّی انسائیکلوپیڈیا) LIBER CONTINENS	موسےٰ فراشی (عقلیہ)
	LIBER ALMANSORIS (طبّی تصنیف یونانی طب سے ماخوذ)	جیرارڈ کریمونوی
الفارابی (وفات ۹۵۰ء)	DISTINCTIO SUPER LIBRUM ARISTOTALIS DE NATURALI AUDITO	〃

ضمیمہ ۳

بارھویں صدی میں		
مصنّف	لاطینی میں تصنیف یا ترجمہ	مترجم
حالی عبّاس (وفات ۹۹۴ء)	LIBER REGALIS (طبّی انسائیکلوپیڈیا ——— ایک حصّہ)	کونسٹنٹائن (از افریقہ) سٹیفن (از انطیوخ) جان (بدوی)
کوئی فاضل عرب	DE PROPRIETATIBUS ELEMENTORUM (جیالوجی پر عربی تصنیف)	جیرارڈ کریمونوی
ابن الہیثم (AL-HAZEN) 965 – 1030	OPTICO THESAURAS (کتاب المناظر)	×
ابی سینا (۹۸۰ء تا ۱۰۳۷ء)	"کتاب الشفا" (سائنس و فلسفہ کا حصّہ)	DOMINICUS GUNDISSALINAS & JOHN SEVILLE
	"کتاب الشفا" (جیالوجی و کیمیا کا حصّہ)	ALFRED OF SARESHAL
	"قانون" (طب)	جیرارڈ کریمونوی
البطروجی (بارھویں صدی)	LIBER ASTRONOMIE (ارسطو کا ارضی مرکزیت کا فلسفہ)	مائیکل سکاٹ (شروع تیرھویں صدی)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ۳

بارھویں صدی میں		
مصنّف	لاطینی میں تصنیف یا ترجمہ	مترجم
ابن رشد (۱۱۲۶ء تا ۱۱۹۸ء)	ارسطو کی :- PHYICA DE CAELO ET MUNDI DE ANIMA اور ارسطو کی دوسری تصانیف پر شرح	مائیکل سکاٹ

ان کتب کے علاوہ یورپ میں کئی سائنس کی یونانی کتب کے ترجمے یونانی سے نہیں بلکہ عربی زبان سے کیے گئے۔ کرومبی کی فہرست میں سے مندرجہ ذیل کتب درج کی جاتی ہیں:-

بارھویں صدی میں عربی سے لاطینی میں ترجمے		
مصنّف	نام کتاب یا ترجمہ	مترجم
بقراط اور اس کے پیرو (پانچویں اور چوتھی صدی) قبل مسیح	APHORISMS	جیرارڈ کریمونوی
ارسطو (۳۸۴ تا ۳۲۲ سنہ) قبل مسیح	منطق METEOROLOGICA PHYSICA	جیرارڈ کریمونوی

ضمیمہ ۳

بارھویں صدی میں عربی سے لاطینی میں ترجمے		
مصنّف	نام کتاب یا ترجمہ	مترجم
	DE CAELO ET MUNDI DE GENERATIONE ET CORRUPTIONE	
	DE ANIMALIBUS (عربی ترجمہ البطریق - نویں صدی)	مائیکل سکاٹ
اقلیدس (۳۳۰ سنہ تا ۲۶۰ سنہ) قبل مسیح	ELEMENTS	ایڈیلارڈ (انگلستان)
APOLLONIUS	CONICA	جیرارڈ کریمونوی
ارشمیدس (۲۸۲ سنہ تا ۲۱۲ سنہ) قبل مسیح	DE MENSURA CIRCULI	//
DIOCLES (دوسری صدی قبل مسیح)	DE SPECULIS COMBURENTIBUS	جیرارڈ کریمونوی
بکوس دمشقی (پہلی صدی قبل مسیح)	DE PLANTIS (DE VEGETABLIS)	ALFRED OF SARESHAL
	LIBER EUCLIDIS DE PONDEROSO ET LEVI	عربی سے لاطینی میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ۳

بارھویں صدی میں عربی سے لاطینی میں ترجمے		
مصنّف	نام کتاب یا ترجمہ	مترجم
PTOLEMY (دوسری صدی عیسوی)	ALMAGEST	جیرارڈ کریمونوی
	OPTICA	EUGENIUS
ALEXANDER (OF APHRODISIAS) (سنہ ۱۹۳ء سے سنہ ۲۱۷ء کے دوران زندہ تھا	DE MOTU ET TEMPORE	جیرارڈ کریمونوی

اِن کے علاوہ اور بھی جو تراجم یونانی سے لاطینی میں ہوئے اُن کے تعارف کرانے والے بھی مسلمان تھے۔ یورپ نے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یونانی سائنس اور اُن کی بنیادوں پر عربی تشریح اور ترقی کو بھی اپنایا اور اس طرح یورپ کا سائنٹیفک ریولیوشن یعنی علمی انقلاب شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔

ریاضی میں مسلمانوں نے عیسائی یورپ کو وہ علم پہنچایا جو یونانیوں اور رومیوں کو میسّر نہ تھا۔ ہندو مہندسوں نے، جن میں آریہ بھٹ (پیدائش سنہ ۴۷۶ء) برہم گپت (پیدائش سنہ ۵۹۸ء) اور بھاسکر (پیدائش سنہ ۱۱۱۴ء) قابلِ ذکر ہیں، ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ ایک ہندسہ کی قیمت، اکائی، دہائی، سینکڑہ، ہزار، لاکھ، کروڑ وغیرہ، تحریر کردہ رقم میں محض اس کے مقام سے معلوم ہو جاتی تھی۔ صفر بھی عربوں نے ہندوستان سے لے کر یورپ کو دیا۔ سکوئر روٹ، کیوب روٹ، فریکشن، ایکویشن، سائن، ٹرگنومیٹری

ضمیمہ ۳

سے ستاروں کی حرکت کا اندازہ، غرض عربوں نے اپنے علمی خزانے ترقی یافتہ اور منظّم صورت میں یورپ کے سپرد کیے۔ یہودی ربی بن عذرا اور اطالوی لیونارڈو نے اِن علوم کو لاطینی کے ذریعے یورپ کا ورثہ بنا دیا۔

روجر بیکن (سنہ ۱۲۱۴ء تا سنہ ۱۲۹۲ء) کے نزدیک سائنس اور کیمیا کے ذریعے کلیسا مسیح کے مخالف دجّال اور تاتاریوں (مسلمان ترکوں) پر غالب آسکے گا۔ روجر بیکن کے خیال میں "سائنس کا بنیادی فائدہ کلیسا اور عیسائیت میں اعتقاد رکھنے والے فرقے کی خدمت اور فطرت پر حاصل کردہ طاقت کے ذریعے عیسائی دُنیا کی حفاظت اور کلیسا کو دُنیا میں انجیل کی تبلیغ میں امداد دینا اور سائنس کی صداقت کے ذریعے ذہن کو اس خالق کی طرف منعطف کرنا ہے جو مسیحیت میں عیاں ہے"[1]۔

یہی روجر بیکن اپنی تصنیف 'EPISTOLA DE SECRETIS OPERIBUS' کے چوتھے باب میں لکھتا ہے:-

"ایسی گاڑیاں بنائی جا سکتی ہیں، جن کے کھینچنے کے لیے جانوروں کی ضرورت نہ ہوگی ..... اڑنے والی مشینیں اور ایسی چھوٹی مشین جو بھاری وزنوں کو اُٹھا سکے اور نیچا کر سکے ..... ایسی مشینیں بنائی جا سکتی ہیں جو دریاؤں اور سمندروں میں چل سکتی ہیں۔ جو بغیر خطرے کے پانی کی تہہ تک لے جا سکتی ہوں اور ایسی لاتعداد چیزیں، مثلاً پُل بغیر زیریں سہارے کے اور ایسے انجن جو نہ دیکھے ہوں نہ سُنے ہوں"۔

عربوں کی سب سے بڑی یورپ کی علمی خدمت یورپ کو ارسطو سے روشناس کرانا ہے۔ بقول ابن رشد:-

"ارسطو کا نظریہ جامع صداقت ہے۔ کیونکہ وہ عقلِ انسانی کی

---

[1] A.C. CROMBIE : FROM AUGUSTINE TO GALILEO.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعلیٰ ترین بلندی تھا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ پروردگار نے اُسے بنایا اور ہمیں دیا تاکہ ہم وہ جانیں جو جاننے کے قابل ہے۔"

ارسطو اور یونانی فلسفی کائنات کی تشریح فطری علل کی بناء پر کرتے ہیں، لیکن کچھ باتیں ارسطو میں عیسائی عقائد سے موافق نہیں۔ مثلاً وہ کائنات کو مخلوق نہیں بلکہ دائمی سمجھتا ہے۔ الکندی، الفارابی، ابی سینا اور ابن رشد نے اسلام سے تخلیق کا خیال ارسطو کے فلسفے میں اس طرح داخل کیا کہ خدا اُن علل کا خالق ہے جن کا لازمی عمل کائنات کو ظہور میں لانا ہے۔

مگر کیونکہ ارسطو کے اوّلین مفسر مسلمان تھے، اس لیے شروع میں عیسائی یورپ نے اُسے شک کی نگاہ سے دیکھا۔ ۱۲۱۰ء میں پیرس یونیورسٹی نے ارسطو کے پڑھنے کی ممانعت کر دی۔ ۱۲۳۱ء میں پوپ گریگوری نہم نے ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ ارسطو کی تصانیف پر نظرثانی کی جائے۔ اور ولیم آف موئربیک نے یونانی سے براہِ راست ارسطو کا ترجمہ شروع کیا۔ اس طرح ارسطو کو اسلامی تشریح کے اثرات سے محفوظ کر کے عیسائی دنیا کے لیے قابلِ قبول بنایا گیا۔

تیرھویں صدی میں روجر بیکن عرب کے ذریعے عربوں کے علوم ریاضی، طبیعات، فلکیات اور طب وغیرہ حاصل کرنے کا حامی تھا اور ان کے مافوق الفطرت عقائد کو اہمیت نہ دیتا تھا۔ انہی دنوں میں ارسطو اور عرب مصنفین طب کے لیے اطالوی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے تھے۔

لیکن وہ فلسفی جنہوں نے آخر کار ارسطو کو عیسائی دُنیا میں قابلِ قبول بنایا البرٹس میگنس[1] اور اُس کا شاگرد ٹامس ایکویناس[2] تھے۔ البرٹس کے خیال میں مذہبی عقیدہ

[1] ALBERTUS MAGNUS (1193 – 1280)

[2] THOMAS AQUINAS (1225 – 1274)

اور اخلاقیات میں حضرت عیسےٰ کے حواریوں اور ہادیانِ دینِ کلیسا کی پیروی مناسب ہے۔ لیکن طبی مسائل میں وُہ بقراط اور جالینوس اور طبیعاتی مسائل میں وہ ارسطو کے آگے سرِ تسلیم خم کرے گا۔ کیونکہ وہ فطرت کو زیادہ پہچانتے تھے۔

البرٹس اور ایکویناس ارسطو کو ابنِ رشد کی طرح سند نہیں مانتے تھے، بلکہ محض رہنمائے فہم و ادراک سمجھتے تھے۔ جہاں ارسطو اور اس کے عرب مفسر عیسائی الہام یا مشاہدہ کے مطابق نظر نہ آتے تھے۔ انہیں غلط سمجھا جاتا تھا۔ خدا اور انسان کو ارسطو کی طرح مجبور نہیں بلکہ مختار سمجھا جاتا تھا۔ مشرق میں بھی جبر و اختیار، تدبیر و تقدیر کے مسائل عرب ذہن پر ارسطو کے اثر انداز ہونے سے پیدا ہوئے ہیں۔

جستجوئے علل کا وہ نظام جو عیسائی مغرب کو مسلمان عربوں کے یونانی، عربی اور دیگر علوم سے متعارف کرانے سے حاصل ہوا۔ اس کے وسیع امکانات نے مشاہدہ اور تجربہ کی اقدار بلند کر دیں۔ نئے علوم کی روشنی نئی جستجو کی رہنما بن گئی۔ اِس طرح یورپ کو وہ عناصرِ قوت حاصل ہوئے جن کی امداد سے یورپ نے بیسویں صدی تک تمام دنیائے اسلام پر تسلّط اور سیاسی غلبہ حاصل کر لیا۔ اور سائنسی، صنعتی، اقتصادی اور حربی اقتدار حاصل کیا جو آج بھی قائم ہے۔

یونانی فلسفہ۔ فطرت مادّہ کے دوام پر یقین رکھتے ہوئے مادّہ کے تغیرات کے علل کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔

ارسطو کے مطابق علمی تفتیش دو پہلو رکھتی ہے۔ جن سے آج علمی دُنیا مانوس ہے۔ یعنی استقرائی (INDUCTIVE) اور استخراجی (DEDUCTIVE) اشیاء کے صفات دو قسم کے ہو سکتے ہیں یعنی موجود اور امکانی۔ تغیر کے ذریعے ہر موجود شے اپنی بنیادی ماہیت کے امکانات کو ظاہر کرتی ہے اور یوں کائنات میں اپنی جگہ پاتی ہے۔

ارسطو کے نزدیک تغیر چار قسم کے ہیں۔ اوّل حرکتِ مکانی۔ دوم ایزادیا کمی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوم ماہیت میں تبدیلی۔ چہارم مادّے میں تبدیلی۔ مثلاً موت کے بعد۔ چوتھے تغیّر کے بعد شئے اپنی پرانی صفات کو چھوڑ کر نئی چیز بن جاتی ہے۔

ارسطو کے نزدیک تغیّر کے بواعث چار قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل میٹیریل یعنی خود مادّے کا تغیّر پذیر ہونا۔ دوم فارمل یعنی صوری۔ سوم ایفی شینٹ (EFFICIENT) یعنی جس ذریعے سے تغیّر ہوتا ہوا نظر آئے۔ چہارم فائنل یعنی آخری یا بنیادی مثلاً خدا۔

مادّہ بغیر صورت کے جو اس کی صفات میں سے ہے ہستی نہیں رکھ سکتا۔ ارسطو کے نزدیک 'لامحدودیت' وقت کی صفات میں سے ہے۔ دائمی تغیّرات کے باوجود مادّہ کی بنیادی ہستی قائم رہتی ہے۔ تمام کائنات مسلسل ہے۔ اس طرح ریاضی علم فطرت یعنی سائنس کا حصّہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ بصری پیمائش (جیومیٹری) فطرت اور مادّہ کے فہم کے لیے لازمی ہے۔ دوسرے علم الحساب مادّے سے الگ ہو کر مادّے کو سمجھنے کا کام سرانجام دیتا ہے۔ غرض اس طرح بارھویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک یورپ میں سائنس کی تاریخ مشاہدہ اور تجربہ کے ساتھ ریاضی اور طبیعات کے میل سے علوم فطرت اور ان کے عملی مفاد کے حصول کی تاریخ بن جاتی ہے۔

یورپ میں دریافت کے دور کے ساتھ ساتھ صنعتی اور فنّی ایجادیں شروع ہوئیں۔ یورپ کو احساس تھا کہ وہ مسلمانوں سے عناصر قوّت حاصل کر رہا ہے اور ان عناصر کی ترقی یورپ کی طاقت اور مسلمانوں پر فتح پانے کے لیے ضروری ہے۔ اسی شعور کے باعث یورپ نے وہ علمی، عملی، اقتصادی اور حربی ترقی کی جس کی وجہ سے کرۂ ارض پر سیاسی غلبہ حاصل کر کے آج مغرب چاند پر حملہ آور ہو رہا ہے۔

آج ہم مغرب کے سامنے نہایت غیر محفوظ حیثیت سے زندہ ہیں۔ چاروں طرف اسلام کی شکست و ریخت کے مناظر آنکھوں کے سامنے ہیں۔ شمالی اور جنوبی امریکہ، آسٹریلیا اور فلسطین کی طرح جہاں وہ مناسب سمجھیں مغربی اقوام اپنی نوآبادیاں

قائم کر سکتی ہیں۔ دنیا میں صرف اسلام ہی وہ اصولِ حیات ہے، جس میں طاقتور کا فرض ہے کہ وہ کمزور کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ انسانیت کی یہ آخری امید خطرے میں ہے۔ اور سب سے زیادہ بدقسمتی خود مسلمانوں کی ذہنی اسلحہ اندازی ہے۔ بم اور گولیاں کھا کر مر جانے سے زیادہ قابلِ رحم وہ زندگی ہے جس میں ہم صداقت کو پہچان نہ سکیں۔ اگر ہم نے اپنی حفاظت کا درست راستہ متعیّن نہ کیا اور عناصرِ قوّت کو دوسرے معاشرتی عناصر سے علیحدہ کر کے حاصل نہ کیا، جیسا کہ عربوں نے غیر مسلموں سے اور عیسائی یورپ نے مسلمانوں سے حاصل کیا تھا، تو اسلام بے سود مصلحت کی بھینٹ چڑھتا رہے گا اور خود فریبی کی مشکوک تسکین کی نذر ہو جائے گا۔ یہ عمل کئی پہلوؤں سے ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

سولھویں اور سترھویں صدیوں میں یورپ کے ذی شعور لوگوں نے فطرت سے ایسے سوالات پوچھنے شروع کیے جو تجربات سے اخذ کیے ہوئے جوابات کے حامل ہو سکیں۔ سولھویں صدی میں ریاضی دان ٹامس ہڈ[1] اور سائمن سٹیون[2] کو انگلستان کی سرکار نے جہاز رانی اور قلعہ سازی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ملازم رکھا۔ پیرس کی سائنس کی اکیڈیمی نے سترھویں صدی میں صنعت و حرفت پر بیس جلدیں تیار کیں۔

سولھویں صدی میں مسلمان طاقتوں کی توپوں سے بہتر توپیں یورپ میں تیار ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ مسلمانوں کے دیئے ہوئے نسخے کے بارود سے زیادہ طاقت ور بارود یورپ میں تیار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پندرھویں صدی میں دیا سلائی سے بارود جلانے کی بجائے یورپ میں چقماق پر گھوڑے کی ضرب سے آگ پیدا کر کے بندوق چلانا شروع ہو گیا تھا۔ گلیلیو اور نیوٹن نے اس مسئلے پر کہ توپ کا گولہ کہاں

---

[1] THOMAS HOOD (fl. 1582–98)

[2] SIMON STEVIN (1548–1620)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گزرتا ہے، بہت دماغ سوزی کی ہوئی ہے۔

یورپ کو اعتماد تھا کہ سائنس بیرونی فطرت کی ساخت کو قابلِ فہم بنا رہا ہے۔ اس سے بقول فرانسس بیکن[1] "فائدہ مندی" کی امید وابستہ تھی۔

تجربہ (EXPERIMENT) کے ذریعے عقل فطرت سے اپنے سوالات کے جواب طلب کرتی ہے۔ بقول جرمن فلسفی ایمینوئل کانٹ[2] سائنس تخلیقی عمل ہے۔ انسانی تصور اُن مشاہدوں تک پہنچتا ہے جو مفروضات سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ عقل مفروضات کے تجربہ کی صورتیں مہیا کرتی ہے۔ سائنسدان ذاتی تجربے کو منظم کر کے حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس طرح سائنس سے خیالات کی ایک نئی تنظیم بن جاتی ہے۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں یورپ میں علومِ فطرت کی ترقی کے لیے منظم سوسائٹیاں بنائی گئیں۔

سب سے پہلی سوسائٹی ACCADEMIA SECRETORUM NATURAE تھی جو نیپلز اطالیہ میں ۱۵۶۰ء میں قائم ہوئی۔

روما نیہ میں ACCADEMIA DEI LINCEI ۱۶۰۳ء سے ۱۶۳۰ء تک قائم رہی۔ گلیلیو اس سوسائٹی کا ممبر تھا۔

فلورنس کے حاکم میدیچی خاندان نے ۱۶۵۱ء میں ACCADEMIA DEL CIMENTO قائم کی جو ۱۶۶۷ء میں ایک شاندار رپورٹ شائع کر کے ختم ہو گئی۔ یہ رپورٹ سائنسی تجربوں پر مشتمل تھی۔

۱۶۶۲ء میں ROYAL SOCIETY OF ENGLAND کو شاہی چارٹر عطا ہوا۔ یہ سوسائٹی طبیعاتی، کیمیائی، حیاتیاتی اور صنعتی علوم میں دلچسپی رکھتی تھی۔

[1] FRANCIS BACON, BARON VERULUM (1561–1626)

[2] EMMANUEL KANT (1724–1804)

انگلستان میں سائنس کے اعلیٰ ترین ماہرین اس سوسائٹی کے ممبر تھے۔

علومِ فطرت کی فرانسیسی اکیڈیمی کی پہلی مجلس ۱۶۶۶ء میں منعقد ہوئی۔ دیکارت[1] اور پاسکل[2] اس سوسائٹی کے ممبر تھے۔ ریاضی، طبیعات اور حیاتیات کے علاوہ اس سوسائٹی کی خاص توجہ ٹیکنولوجی اور ایجادات کی طرف تھی۔

برلن اکیڈیمی جرمن فلسفی لی بنٹز[3] کی تحریک سے ۱۷۰۰ء میں قائم ہوئی اور ۱۷۲۴ء میں سینٹ پیٹرز برگ میں سائنس کی روسی اکیڈیمی قائم کی گئی۔ ان کے علاوہ کئی سوسائٹیاں یورپ کے چھوٹے ممالک میں اِن اکیڈیمیوں کی نقل میں سائنس کی ترقی کے لیے قائم ہوئیں۔

آج کل یورپ اور امریکہ میں ہر بڑے صنعتی کارخانے کے ساتھ ایک تجربہ گاہ ملحق ہے، جو یونیورسٹیوں کی تجربہ گاہوں سے تعلق رکھتی ہے۔ کئی یونیورسٹیوں کی تجربہ گاہوں کو صنعتی سرمایہ داروں کی طرف سے وظائف ملتے ہیں۔ سوویٹ روس میں ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے یونیورسٹیوں کی تجربہ گاہوں میں کام ہوتا ہے اور اُنہیں ہر قسم کی امداد دی جاتی ہے۔ یہی حال ہٹلر کی جرمنی کا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بڑی یونیورسٹیوں کو فوجی منصوبوں پر ریسرچ کرنے کے لیے کروڑوں ڈالر کی سرکاری امداد ملتی ہے۔

فریڈرک اعظم شہنشاہ جرمنی، روس کی زارینہ کیتھرینا، فلورنس کے میدیچی خاندان کے حاکم، برطانیہ، فرانس اور دوسرے یورپی ممالک کے بادشاہ اِن مجالس کو سائنسی ریسرچ کے لیے نہایت فراخدلی سے امداد دیتے تھے۔ ان مجالس میں سائنسدان اپنے بادشاہوں کے لیے تجارتی، حربی اور سیاسی اہمیت کے مسائل پر

[1] DESCARTES (1596–1650)

[2] PASCAL (1623–1662)

[3] GOTTFRIED WILHELM VON LEIBNITZ (1664–1716)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریسرچ کرتے تھے۔ نیوٹن انگلستانی بحریہ کے متعلق ریاضی کے مسائل پر کام کرنے کے لیے اعلیٰ مشاہرہ پاتا تھا۔ بیسویں صدی کے شروع تک سمندروں کی لہروں پر برطانوی بیڑے کی حکومت میں نیوٹن کی علمی مساعی کی امداد بھی شامل تھی۔

ظاہر ہے کہ صدیوں پہلے یورپ کو اس حقیقت کی مکمل آگاہی تھی کہ علومِ فطرت اور تکنیکی ایجادات عناصرِ قوت ہیں۔ ان صدیوں میں مسلمان یہ احساس کھو چکے تھے کہ عناصرِ قوت کیا ہیں۔ نہ یہ سمجھتے تھے کہ یورپ کی عناصرِ قوت میں برتری تمام دُنیا میں مسلمانوں کی بربادی اور غلامی میں منتج ہوگی۔ مسلمان ایک دوسرے سے قریبی خوف میں مبتلا تھے اور مستقبل میں دور تک دیکھنے کی فرصت نہ رکھتے تھے۔ اِن حالات کا آخر کار لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۸ء میں پہلی عالمی جنگ کے بعد اسلامی دُنیا کا ایک مربع انچ علاقہ بھی یورپ کے تسلّط یا سیاسی قابو سے آزاد نہ تھا۔ انسانی دُنیا کی تقدیر اب مغرب کی مرضی سے متاثر تھی اور انسانی دُنیا کے مجبور حصے میں مسلمان بھی شامل تھے۔

امریکہ اور روس آج کل عناصرِ قوت میں اعلیٰ ترین معراج پر ہیں۔ مگر کیا عناصرِ قوت میں اُن سے قریب ہونے کے لیے امریکی سرمایہ داری یا روسی اشتراکیت کو قبول کرنا ضروری ہے؟ کیا ان کی معاشرتوں اور تہذیبوں کی نقل ضروری ہوگی؟ ممکن ہے کہ خود غرضانہ عشرت کے تقاضے بے وقوف دلوں کو یمین و یسار کے مے خانوں کی جانب بھٹکنے پر مائل رکھیں لیکن معقولیت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم سائنسی اور صنعتی ترقی کرنے کے لیے سائنسی اور صنعتی ترقی کی طرف توجہ مرکوز رکھیں۔ ہماری سلامتی کے لیے یہی صراط المستقیم نظر آتی ہے ؂

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سول ایجنٹ

مکتبہ اشاعت ادب

عنایت اللہ بلڈنگ۔ انارکلی۔ لاہور